ادبی تبصرے

ادبی تبصرے

ڈاکٹر، مولوی عبدالحق صاحب

دانش محل، لکھنؤ

سنہ ۱۹۴۷ء

قیمت ایک روپیہ دو آنے عہ

باہتمام حاجی محمد اسماعیل صدیقی، ادبی پریس لکھنؤ میں چھپی

ناشرین

"دانش محل" امین الدولہ پارک، لکھنؤ

فہرست

رُوحِ ادب

یہ منشی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ کے نثر و نظم کے مجموعے کا نام ہے، حضرت جوشؔ ایک مستعد پُر جوش اور جدت پسند شاعر اور نثار ہیں۔ نثر میں جا بجا جدت سے کام لیا ہے اور فرضی تصویروں میں اصلیت کا رنگ دکھایا ہے۔ استعارات و تشبیہات کی اس قدر بہتات ہے کہ مسلسل پڑھنے سے جی اُکتا تا ہے اور کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑتی ہے۔ طرز تحریر کے ساتھ خیالات میں بھی انوکھاپن دکھایا ہے۔ لیکن ان میں نہ کم ہے۔ بعض جگہ ٹیگور کا تتبع کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کامیابی ہوئی ہے لیکن اکثر جگہ ناکامی نظر آتی ہے اور مضمون پھیکا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کامیابی کی ایک مثال شاید وہ آجائے کے مضمون میں صاف نظر آتی ہے۔ بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے، اگرچہ وہ زیادہ قابل لحاظ نہیں تاہم نہ ہوتی تو بہتر ہوتا۔ مثلاً **عجیب شیرینی** کا پہلا جملہ "ایک رنگین عارضوں والی دوشیزہ" یا اس شعر میں "اشک" کا لفظ

تمھارے سامنے کیوں اشک میرا بہہ نہیں سکتا
اسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا

بعض جگہ حضرت اکبر کا تتبع کیا ہے۔ لیکن شعر نہایت پست اور عامیانہ ہو گئے

ہیں۔ مثلاً :-

ہر اسٹیشن پہ وہ اک زخم کاری دل پہ کھاتے ہیں   سفر کرتے ہیں یا ہم جنگ کے میداں میں جاتے ہیں

رنگیں رخوں نے ذبح کیا دل کو ریل پر   مرنے کو اور جائیے پنجاب میل پر

یہ رنگ جوش کی طبیعت کے مناسب نہیں۔ اس میں طبع آزمائی کرنا اُن کے لیے زیبا نہیں۔

حضرت جوش فطرت پسند واقع ہوئے ہیں اور بار بار اس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ونثر میں کیا ہی اور بعض مقامات پر قدرتی مناظر اور ان کے اثرات کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہی۔ اسی طرح مختلف انسانی جذبات کو بھی بڑی نزاکت سے الفاظ اور خیال کی رنگینی میں ظاہر کیا ہی۔ جوش صاحب نے نثر میں بعض انگریزی انشاپردازوں کی تقلید کی ہی مگر یہ طرز تحریر خاص خاص مضامین کے اظہار کے لیے موزوں ہوسکتا ہی۔ ہر جگہ کام نہیں آسکتا اور اس کے نبھانے کے لیے علاوہ زبان کی قدرت کے خیال کی بلندی بھی درکار ہی۔ اس مجموعے کے مختلف مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ابھی یہ پہلی مشق ہی مگر تاہم اس میں کامیابی اور کمال کی جھلک نظر آتی ہی۔

بلاشبہ حضرت جوش ایک جواں طبیعت، جدت پسند اور ہونہار شاعر اور ناثر ہیں۔ لیکن جدت کے جوش میں انھیں ذوق سلیم کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے ان کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہی۔ حصول کمال کے لیے اس سے بچنا ضرور ہی۔

لیکن سب سے زیادہ مایوسی اور رنج ہمیں اُن تصویروں کو دیکھ کر ہوتا ہی جو اس کتاب میں بعض مضامین فطرت و جذبات کے ساتھ چسپاں کی گئی ہیں۔ اس سے

صنف کے ذوق کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہی۔ بجائے اس کے کہ یہ تصویریں اُن
جذبات کی گرمی اور حُسن کو بڑھائیں دیکھنے والے پر اُلٹا اثر کرتی ہیں یہ عجب ہو کہ قابل
صنف نے اس قسم کی ادنیٰ عامیانہ اور بازاری تصویروں کا اس مجموعے میں داخل
رنا کیوں گوارا کیا۔ بعض تصویروں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سگرٹ کے بکسوں
کی جو تصویریں آتی ہیں ان کی ہو بہو نقل کر دی ہو یا انگریزی اخباروں اور رسالوں
کے اشتہاروں سے لی گئی ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ تصویریں شریک ہی نہ کی جاتیں
ورنہ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا اور نازک خیال مصوّروں سے بنوائی جاتیں۔
کاغذ بہت اچھا استعمال کیا گیا ہو لکھائی چھپائی بھی اچھی ہو۔ مگر اس درجہ کی
ہو جیسی کہ ہونی چاہیے تھی ——

——◆⁂⁂⁂◆——

مرہٹی دنّاں[1] کوش

یعنی

[مرہٹی اِنْ سائیکلو پیڈیا]

جلد اوّل

اہلِ مہاراشٹر قابل مبارک باد ہیں کہ جس علمی مہم کی تکمیل کے درپی وہ کئی سال سے تھے اس کی پہلی قسط اب شایع ہوئی ہی۔ کتاب کے اصل مطالب پہ بحث کرنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس کی ابتدا و قیام کا مختصر سا ذکر کر دیا جائے۔

اِس سے اہلِ مہاراشٹر کی معاملہ فہمی اور دُور بینی کا پتہ چلتا ہی کہ اس قاموسِ علمی کی تالیف کے لیے اُس کے بانیوں اور منتظموں نے (جیسا کہ ہمارے ہاں کا معمول) کسی راجہ مہاراجہ کے سامنے دست گدائی نہیں پھیلایا اور نہ کسی سے عطیے کی خواہش کی، بلکہ یہاں تک احتیاط کی ہی کہ اگر کوئی عطیہ دینا چاہے بھی تو وہ قبول نہیں کرتے۔ اس علمی مہم کے اصل بانی اور روحِ رواں ڈاکٹر سری دھر وینکٹیش ایم، اے، پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ انھوں نے اس کام کے چلانے کے لیے جو محنت طلب ہی نہیں بلکہ زر طلب بھی ہی، یہ ترکیب نکالی کہ دناں کوش منڈل کے نام سے ایک کمپنی قایم کی۔ سرمایہ کا پہلا اندازہ پچاس ہزار روپیہ کیا گیا تھا۔ جو پانسو حصوں میں تقسیم کیا گیا مگر خریداروں کو ایک حصہ سَو رُپی کا ۸۵ رُپی میں دیا گیا اس کے بعد پھر پانسو

---

[1] یہ وہی لفظ ہی جو ہندی میں گیان ہو گیا ہی اور اصل سنسکرت میں جنان ہی۔

بچاس ہزار رُپے کے نکالے گئے۔ پہلے خریداروں کو سَو رُپے کا حصہ پچاسی رُپے میں دیا گیا۔ لیکن دوسری بار سو کا حصہ سو ہی میں دیا گیا۔ اس کے بعد حصے کی قیمت ایک سو پینتیس ہوگئی اور کتاب کے شایع ہونے تک ڈیڑھ سو رُپے ہو جائے گی۔

اس کمپنی کی رجسٹری ۸ رجولائی ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور ۲۰ رمارچ ۱۹۱۷ء میں کام کا آغاز ہوا۔

ابتدا میں اس کا صدر دفتر ناگپور میں تھا اور پونا، بمبئی اور لنڈن میں اس کی شاخیں قایم کی گئیں۔ مگر بعد ازاں (غالباً ۱۹۱۹ء میں) صدر دفتر پونا میں منتقل ہوگیا اور شاخوں کی ضرورت نہ رہی۔

اس ادارے کے چیف اڈیٹر اور منتظم ڈاکٹر کیتکر ہیں اور پندرہ اور تعلیم یافتہ اور قابل اشخاص اُن کی زیر نگرانی انسائیکلوپیڈیا اور دفتر کا کام کرتے ہیں، علاوہ ان اصحاب کے جو دفتر میں کام کرتے ہیں، دوسرے ایسے اہل علم سے بھی معاوضہ دے کر مضمون لکھوائے گئے ہیں جو اپنے اپنے فن کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً ان مضامین کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت واقع ہوئی ہے جو دنیا کی مختلف زبانوں سے انتخاب کر کے مرہٹی میں لکھے جائیں گے۔ اس کا انتظام دفتر میں نہیں کیا گیا اور نہ ایسا ممکن تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان ماہرین فن کو فرصت نہیں ہوتی تو ادارہ کی طرف سے تنخواہ دار آدمی اُن کی مدد کے لیے بھیج دیا جاتا ہے لیکن ان مضامین کی تنقید و نگرانی وغیرہ دفتر ہی میں ہوتی ہے۔ دفتر کے لیے صرف ایسے مضامین رکھے گئے ہیں جن کو مختلف کتابوں سے منتخب کر کے تیار کرنا پڑتا ہے، مثلاً تاریخی معلومات وغیرہ جو مسلمہ اور مستند کتابوں سے جمع کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر کیتکر کی تنخواہ ابتدا میں تین سو رُپے ماہانہ تھی۔ بعد میں چار سو پچیس ہوگئی۔ ہم نے اس ادارے کا معاینہ ۱۹۱۹ء میں کیا تھا اور جہاں تک ہمیں یاد ہے اس کا

ماہانہ خرچ دو ہزار روپیہ تھا۔ منتظمین سے گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ اس کتاب کی تکمیل
میں چھ سال صرف ہوں گے۔ اور ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ تھا کہ ابتدائی
چار جلدیں ہندستان اور دُنیا کے عام معلومات اور اہم مباحث پر ہوں گی۔ باقی
جلدوں میں معلومات لغت کے طور پر بہ ترتیب حروف ابجد درج ہوں گے۔ چنانچہ
پہلی جلد ابھی شایع ہوئی ہے اور اس کا عنوان "ہندستان و جگ"۔ (ہندستان
اور دُنیا) ہے۔

علمی اصطلاحات کی دِقت ہر دیسی زبان میں پائی جاتی ہے اور یہی مشکل مرہٹی زبان
میں بھی پیش آئی۔ یہ مسئلہ بارہا مرہٹی پبلک کے سامنے پیش ہوا۔ مگر کوئی خاطر خواہ
نتیجہ نہ نکلا۔ لہذا منتظمین ان سائیکلو پیڈیا کو علمی اصطلاحات کی لغت بھی تیار کرنی پڑی
اُن کے بیان کے مطابق یہ لغت یکم دسمبر ۱۹۱۶ء کو مکمل ہو جانی چاہیے تھی۔ انھوں
نے ہر انگریزی لفظ کے لیے جدید مرہٹی لفظ وضع نہیں کیا۔ بلکہ جو الفاظ اس سے
قبل بعض مصنفین نے وضع کیے ہیں یا جو الفاظ قدیم سے زبان میں رایج ہیں انھیں
تنقیدی نظر سے دیکھا ہے اگر وہ صحیح ہیں اور مفہوم ادا کرتے ہیں تو انھیں بجنسہٖ قائم رکھا
ہے۔ البتہ جن اصطلاحات کے لیے مرہٹی میں الفاظ نہیں ہیں ان کے لیے جدید الفاظ
وضع کیے ہیں۔ اس کے لیے انھیں سائنس اور دیگر علوم کی تمام کتابیں جو اب تک
مرہٹی میں لکھی گئی ہیں جمع کرنی پڑیں۔ نیز وہ ماہانہ رسالے وغیرہ بھی جمع کیے گئے
جن میں کبھی کبھی علمی مضامین شایع ہوئے ہیں۔

جرمن اور فرنچ زبانوں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ہندستان کے متعلق بعض مضامین
کے لیے جن کا تعلق سنسکرت کے ادب اور قدیم زمانے سے ہے ان زبانوں میں بیش بہا
ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کام دو صاحبوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب
نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی ہے اور دوسرے صاحب ایک مدت تک فرانس میں

رہے ہیں اور فرانسیسی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔

معلومات کے بہم پہنچانے میں اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ اس طور سے لکھی جائیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

ہندستان کے متعلق عام طور پر اور خاص طور پر بہار اسٹیٹ کے متعلق معلومات تفصیل سے دی گئی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے متعلق اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

حتیٰ الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ مضامین طویل نہ ہوں۔ شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہوگا جو آٹھ صفحے سے زاید ہو (کتاب کی تقطیع ۲۶ × ۳۰ ہے اور ہر صفحے کے دو کالم ہیں)

تصویریں بھی ہوں گی (کتاب کی خوبصورتی کے لیے نہیں بلکہ مطالب کے سمجھنے کے لیے)۔

جہاں تک ممکن ہوگا جدید ترین معلومات بہم پہنچائی جائیں گی۔

ہندو تمدن و تہذیب اور علوم و فنون کے متعلق جہاں تک ممکن ہوگا کامل معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ زمانہ وید سے لے کر اب تک جتنے مذاہب اور فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا۔ بدھ۔ جین، سن بھاؤ وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا جائے گا غیر طرفدارانہ ہوگا۔ اُن کے خیالات و عقاید کی صداقت و غیر صداقت سے بحث نہیں کی جائے گی۔ صرف ان کی رائیں اور عقاید لکھ دیے جائیں گے۔ البتہ ان فرقوں کے تنزل و انحطاط کے اسباب کا ضرور ذکر کیا جائے گا۔

عام تاریخی مضامین کے متعلق صرف اسی قدر لکھا جائے گا جس کا علم یقینی ہے۔ جو حالات ابھی مشتبہ ہیں اور پایہ تحقیق کو نہیں پہنچے اُن کے لکھنے سے احتراز کیا جائے گا۔

اپنی طرف سے کسی قسم کی جدید اختراع یا جدید تحقیقات نہیں کی جائے گی۔لیکن جو معلومات تحقیق کو پہنچ چکی ہیں وہ سادہ زبان میں بیان کردی جائیں گی۔

زمانۂ حال کے حالات ایک جگہ جمع کردیے جائیں گے۔سائنس سے متعلق امور پر مختلف مضامین لکھے جائیں گے۔جہاں ضرورت محسوس ہوگی وہاں ایک مبحث پر دو دو مضمون ہوں گے۔ایک عام ناظرین کے لیے اور دوسرا خاص لوگوں کے لیے۔اور یہ الگ الگ ٹائپ میں چھاپے جائیں گے۔

ان جدید علمی الفاظ کے ساتھ جو وضع کیے گئے ہیں قوسین میں اصلی انگریزی الفاظ بھی لکھ دیے جائیں گے۔

ان علوم کے متعلق جن میں مغربی اور مشرقی طرز خیال جُدا جُدا ہے۔(مثلاً کیمسٹری طب، موسیقی، نجوم وغیرہ) ان پر مغربی اور مشرقی نقطۂ نظر سے الگ الگ مضمون لکھے جائیں گے۔دونوں کو ایک دوسرے سے ملایا نہیں جائے گا۔

ان خاص خاص مضامین کے متعلق جو ہندستان سے مخصوص ہیں۔مثلاً منتر شاستر، جوتش اور روحانیات کے بعض طریقے، ہماری رائے تشکّکانہ رہے گی۔ مگر ان کی تاریخی نشو و نما، اور ان کے طریقے اور اعمال بے کم و کاست درج کیے جائیں گے۔

تاریخ ہندستان کی مفصلہ ذیل تقسیم کی جائے گی:۔

(۱) زمانۂ وید (۲) مابعد وید آمدِ مسلمانان (۳) مسلمانوں کا عہد (۴) یورپی عہد (۵) ہندستان کی دوسری قوموں کی تاریخ (مثلاً راجپوت، سکھ، گورکھا برہمی، اُڑایا وغیرہ)

مرہٹوں کی تاریخ پر علیحدہ مضمون ہوگا۔

جغرافیہ۔یورپ کا جغرافیہ، ایشیا کا جغرافیہ (جس میں ہندستان کا جغرافیہ

داخل نہ ہوگا) امریکا، افریقہ، اوشینیا کا جغرافیہ۔

معاشرتی حالت ۔قانون (ہندستان اور تمام دنیا کے) دھرم شاستر (ہندوؤں کا قانون)

معاشی ۔ (اقتصادی) تجارت اور اس کے متعلق دوسرے شعبے۔

مذاہب اور مذہبی فرقے۔

انسان کی مختلف نسلوں کا ذکر

سائنس ۔کیمسٹری، ارضیات، زراعت، نباتات، عضویات، ریاضیات، ہیئت، بلاغت، موسیقی، تعلیم، تاریخی تحقیقات، تاریخ ادب، مصوری، جنتر (میکانک)، انجینیری، ہندی طب، مغربی طب۔

یہ ہی خلاصہ اس کارنامے کا جو مرہٹی اِن سائیکلوپیڈیا کے منتظمین کے پیشِ نظر ہی اور جسے ہم نے عام اطلاع اور معلومات کے لیے درج کر دیا ہی۔ ممکن ہی کہ آیندہ کام کرنے والوں کو اس سے کچھ مدد ملے۔

اب ہم پہلی جلد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ جلد مفصلۂ ذیل چھ ابواب اور ایک ضمیمہ پر منقسم ہی۔ (تعداد صفحات ۵۰۰)

پہلا باب ۔دُنیا میں مناقشہ اور مقابلہ۔

دوسرا باب ۔ہندستان کا سیاسی تعلق (دوسرے ممالک سے)۔

تیسرا باب ۔ معاشرتی تعلق (دوسرے ممالک سے)

چوتھا باب ۔ ہندستان اور ہندو۔ ان کا تعلق دنیا سے بلحاظ تہذیب و تمدن و روحانیات۔یعنی ان کا اثر دنیا کی دوسری اقوام پر۔ اور دوسری اقوام کا اثر ان پر۔

پانچواں باب۔ ہندو جماعت کی اندرونی حالت اور اس کا تعلق ہندستان کی دوسری اقوام سے۔

چھٹا باب۔ قومی مذہب (نیشنل ریلیجن) قایم کرنا۔ قومی دھرم اور سیاسی قوت رائے عامہ (پبلک اوپینین) اور عوام (پبلک) کی قوت سے کیا توقع ہوسکتی ہو۔ ہندو سوسائٹی کو ترقی دینا (یعنی ہندو خیالات کو پھیلانا۔ تعصب کو کم کرنا اور پھر چاروان قایم کرنا) آیندہ معاشی (اقتصادی) حالت۔ قومی تحریک۔ مہاراشٹر کی تاریخ اور ان کی تجارت اور معاشرت۔ مفتوحہ اقوام کی معاشی حالت۔ ہندستانی اور یورپی معاشرت کا مقابلہ۔ بنک۔ کواپریٹیو سوسائٹیاں (انجمن ہائے اتحادی) مختلف ذاتوں اور قوموں کی حفاظت۔

ضمیمہ۔ کانگریس کا جدید دور۔ پنجاب و خلافت کے واقعات۔ عہدنامہ سیورے۔

اس جلد کے پہلے حصّے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہو کہ ہندی تمدن کا اثر دنیا کے ممالک پر غیر ممالک کا اثر ہندستان پر کیا ہوا۔ اس بحث میں سیلون اور برہما کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہو اور یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ ملانے اور ہندستانی معاملات میں متحد کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہ ہم سے زیادہ قریب اور ہندستانی تمدن کے زیادہ زیر اثر ہیں۔ اس کے بعد جاوا سماترا بورنیو، سنگلدیپ۔ لکادیپ، چین، جاپان، تبت، افغانستان، بلوچستان، افریقہ یونان و روم وغیرہ کا مختصراً ذکر کیا ہو اور یہ بتایا ہو کہ قدیم زمانے میں ان ممالک پر ہندستان کے تمدن و تہذیب کا اثر کن کن طریقوں سے ہوا اور یونان و روما نے ہماری تہذیب پر کیا اثر ڈالا۔ اصل واقعہ یہ ہو کہ ان ممالک پر ہندی تہذیب کا اثر بدھ مذہب کے ذریعے سے ہوا۔ اس مذہب کے دعاۃ (مشنری) غیر ملکوں میں

جاتے اور اپنے مذہب اور خیالات کے اشاعت کی کوشش کرتے تھے چنانچہ بدھ مذہب کی اکثر کتابوں کے ترجمے چینی جاپانی زبانوں میں ہوئے اور اب بھی ان کی کتابیں چین و جاپان اور تبت میں ملتی ہیں۔ مگر تعجب ہی کہ اس ضمن میں فاضل مؤلف نے اسلامی تمدن و تہذیب کے اثر کا جو ہندستان پر ہوا، ذکر نہیں کیا۔ افریقہ کے متعلق وہ یہ لکھتے ہیں کہ آج کل جو ہندستانی وہاں جاتے ہیں اُن کی حالت قلیوں کی ہی اور اس لیے ہندی تمدن کا اثر وہاں نہیں ہو سکتا۔

باقی ابواب میں ملک کی اندرونی حالت اور اس کے مختلف شعبوں پر بحث کی گئی ہی۔ مگر طرز بیان دل کش اور صاف نہیں ہی اور ابواب کی تقسیم اس طور سے کی گئی ہی کہ چند مخصوص خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہی ان سائیکلو پیڈیہ کے لحاظ سے جن معلومات کا بہم پہنچانا ضروری تھا وہ اس میں پایا نہیں جاتا۔ ان مضامین کی حیثیت اخبار کے معمولی مضامین کی سی ہی جن پر بہت کم محنت کی جاتی ہی مناسب یہ ہوتا کہ ہر باب ایسے شخص سے لکھوایا جاتا ہی اس مضمون پر پوری طرح حاوی ہوتا۔ ہم ذیل میں چند خاص خیالات کا ذکر کرتے ہیں جو ڈاکٹر کیتکر صاحب نے ملک کی اصلاح کے متعلق ان ابواب میں ظاہر کیے ہیں۔

سب سے بڑا زور انھوں نے اس بات پر دیا ہی کہ "قومیت کا مذہب" رائج کرنا چاہیے۔ عیسائی، مسلمان، یہودی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہیے کہ ہندستان ہمارا دیس ہی اور سب ذاتیں اور سب مذاہب ایک ہیں۔ اس خیال کو عمل میں لانے کے لیے چھوت ترک کر دینی چاہیئے اور باہم شادی بیاہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس خیال میں عام لوگوں کو ساتھ رکھنا چاہیے ورنہ چند لوگوں میں اس خیال و عمل کے محدود رہنے سے ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ ہرگز کوئی جدید فرقہ نہ بنانا چاہیے اور موجودہ سوسائٹی (جماعت)

میں رہ کر یہ اصلاحیں عمل میں لانی چاہئیں - یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہندو ہیں بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم "ہندی" ہیں اور یہ خیال طرح طرح سے لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہیے - اور ہندو پارسی مسلمان نام ترک کر دینے چاہئیں - کیونکہ یہ ایک قسم کی تنگ خیالی ہے - اہل یورپ نے جس طرح قومیت حاصل کی ہے ہمیں بھی اسی طریقے سے حاصل کرنی چاہیے - مگر زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ -

وہ ذات کا امتیاز مٹانے کے حامی ہیں - لیکن کہتے ہیں کہ پہلے جو مذہبی یا معاشرتی مصلح ہوئے ہیں ان میں اکثر ایسے تھے جنھیں اپنی شہرت یا نمود و نمایش منظور تھی اور اُن کے کام نیک نیتی پر مبنی نہ تھے - بعض ایسے بھی تھے جن کا فعل نیک نیتی پر مبنی تھا - لیکن ان میں اس کا سلیقہ یا شعور نہ تھا - وہ حکیم یا ڈاکٹر نہ تھے بلکہ عطائی تھے اور اس لیے انھیں کامیابی نہ ہوئی - اگرچہ ہمیں کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ بات ہمیں غیر ملک والوں (انگریزوں) نے سجھائی ہے - انھوں نے ہمیں متحد ہونا، ذات پات کی تفریق مٹانا، باہم ہمدردی کرنا اور قوم بننا سکھایا ہے - اُن کے نمونے سے جو بات ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اس سے قبل ہمیں کسی مصلح کی کوشش وسعی سے حاصل نہیں ہوئی تھی - ہمیں وہ "گھر چیک"[1] نہیں کرنی چاہیے جو بدھ یا رام موہن رائے نے کی تھی - اس کے لیے اعلیٰ درجہ کا ایثار، اخوت کا بلند خیال اور سوشل سائنس (عمرانیات) کے اصول درکار ہیں - بدھ اور رام موہن رائے کی کوششیں قبل از وقت تھیں اور اس لیے بیکار ثابت ہوئیں -

ڈاکٹر صاحب کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ جو لوگ ہندوؤں سے قریب تر ہیں انھیں ہندو بنانے کی کوشش کرنی چاہیے - تین ہزار ذاتیں جو بن گئی ہیں وہ

---

[1] یہ مرہٹی محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی بڑی چوک جتنا گھوڑا - یعنی بہت بڑی غلطی -

توڑ دی جائیں اور ان کی ایک ذات بنا دی جائے۔ اُن کے فرق مٹانے سے ایک ذات ہو سکتی ہے۔ اگرچہ سب فرق نہیں مٹ سکتے تاہم ایک ذات بنانے کے لیے جو فرق مٹانے ضروری ہیں وہ ممکن ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ صدہا ذاتوں کو مٹا کر پھر قدیم چار ذاتیں قایم کرنے چاہئیں۔

کہتے ہیں کہ قومیت کو مذہب بنانے کے لیے ضرورت ہے کہ سوسائٹی کی حالت یکساں کی جائے، لوگوں کی سیاسی قوت بڑھائی جائے، ملک کی مختلف قوموں اور اہل تمدن کو اس مذہب کی تعلیم دی جائے، سوسائٹی کا نظم ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے ملک کے سب لوگ متحد ہو جائیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مذہبِ قومیت کی کہیں تصریح نہیں کی کہ اس سے ان کا کیا منشا ہے اور کیوں کر مختلف قوموں کو جو اس ملک میں آباد ہیں اس مذہب کی تلقین کی جائے۔ جو امور یا اصول انھوں نے اوپر بیان کیے ہیں وہ بہت مبہم ہیں۔ ایسی حالت میں مہاتما بدھ اور راجہ رام موہن رائے کو الزام دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

کتاب کے مختلف مقامات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندی تہذیب کو رواج دیا جائے، ہندی عیسائیوں اور پنچ قوموں کو اپنے ساتھ ملایا جائے اور اپنا ادب ان میں شایع کیا جائے۔ ایک دوسرے مقام پر ایک صورت اور بھی بیان کی ہے جس سے اتحاد میں مدد مل سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم زبان کے لحاظ سے کی جائے اس میں سرکار کا فایدہ بھی ہے اور رعایا کا بھی۔ سرکار کا فایدہ یہ ہے کہ عہدہ داروں کا تبادلہ ایسے مقامات پر نہ ہوگا جہاں کی زبان دوسری ہے اور اس لیے انھیں رعایا کے حالات و خیالات سے زیادہ واقفیت ہوگی۔ تعلیم کی اصلاح میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اس وقت اُن کا حلقہ بہت محدود ہے۔

اگر دیسی زبان ذریعۂ تعلیم ہو گئی تو لوگوں میں تعلیم کی اشاعت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس وقت سر رشتۂ تعلیم زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے لوگوں میں بدگمانی پیدا ہو گئی ہے کہ سرکار کا منشا دیسی زبانوں کو مٹانا ہے بعض سرکاری عہدہ داروں کی مخالفت سے نیز سرکاری مشکلات کا صحیح اندازہ نہ کرنے سے ایسا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی زبانیں مٹا دی گئی ہیں اس لیے لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ زبان کے مٹانے سے ہماری قومیت بھی جاتی رہے گی۔ ایک فائدہ سرکار کا یہ ہے کہ سرکاری احکام اور تحریرات دیسی زبانوں میں ہونے سے سرکار اپنے خیالات اور منشا کو زیادہ وضاحت اور خوبی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ جب کسی صوبے میں ایک ہی زبان ہو گی تو سرکار کو اپنے خیالات اور منشا کی اشاعت میں آسانی ہو گی۔ متعدد زبانوں کی حالت میں مشکل ہوتی ہے۔

رعایا کا فائدہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سمجھا سکیں گے۔ آپس میں زیادہ ہمدردی اور آشتی ہو جائے گی۔ ہندستانی زبانوں کو زیادہ ترقی ہو گی۔ دیسی زبانوں کی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم بڑھے گی اور سوسائٹی زیادہ ترقی کرے گی۔ جب دیسی زبانیں ذریعۂ تعلیم اور سرکاری اور دفتری کاروبار کا واسطہ ہو جائیں گی تو ملک میں مشترکہ تہذیب کی بنا پڑ جائے گی۔ غیر ملکوں کے اختراعات و ایجادات دیسی زبانوں میں آنے سے ملک کو بہت فائدہ ہو گا۔ جتنا ہم دیسی زبان کا درجہ بڑھائیں گے اتنی ہی ان لوگوں کی قدر و وقعت زیادہ بڑھ جائے گی جو اس زبان کے بولنے والے ہیں۔ اس طرح ملک میں مساوات سی ہو جائے گی۔ اور قلیل جماعتیں بھی ساتھ ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے آخری باب نیز ضمیمہ میں اس وقت کے بعض معاملات پر بھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں حکومت و مذہب

جُدا جدا نہیں بلکہ ایک ہیں۔ سب مسلمان ایک ہیں۔ خلافت اُن کا مرکز ہی۔ دُنیا پر حکومت کرنا اور دوسروں کی دولت لوٹنا اور اس کے ساتھ مذہب کی اشاعت کرنا ان کا اصول حکومت ہی۔ پان اسلام ازم نے خلافت کو قوت دی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی اتحاد و اخوت کو بڑھایا جائے اور اسلامی تہذیب کی اشاعت کی جائے۔ اوّل اوّل سرکاری عہدہ داروں نے اسے مدد دی تاکہ ہندی اتحاد میں کھنڈت پڑ جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہو کہ جب تک خلافت کی قوت باقی رہے گی مسلمانوں میں اس ملک کی محبت پیدا نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ خیبر کے خواب دیکھتے رہیں گے۔ اب جو بعض یورپی دول کی بدولت خلافت کی قوت زیر و زبر ہو گئی ہی تو مسلمانوں میں حبِ وطن پیدا ہوگی۔ مسٹر گاندھی اور ان کے ہندو اعوان و انصار جو خلافت کے لیے اس قدر جد و جہد کر رہے ہیں تو اُن کا منشا کیا ہو؟ یہ دیکھ کر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ یہ بدمعاش ہیں یا بیوقوف؟ کسی کے دل کا حال معلوم کرنا نہایت مشکل ہو لیکن حالات و قراین پر نظر ڈالنے سے اصل منشا کو معلوم کر سکتے ہیں۔ موجودہ حالات و قراین کو بغور معاینہ کرنے سے یہ خیال ہوتا ہو کہ ہندوؤں نے جب یہ دیکھا کہ خلافت اب بے جان ہو گئی ہو اور اس کے سرسبز ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو انھوں نے کہا، لاؤ زبانی ہمدردی کرنے میں ہمارا کیا ہرج ہی۔ ہماری کوششوں سے خلافت کو پہلی سی قوت تو حاصل ہوگی نہیں اور اگر تھوڑی بہت ہوئی بھی تو دُنیا میں تو اُسے وہ عروج نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان دنیا کے فاتح ہو سکتے ہیں تو مفت کرم داشتن میں ہمارا کیا نقصان ہی، بلکہ مسلمانوں سے ہمدردی کرنے میں یہ فایدہ ہو کہ وہ ہمارے معاملات میں ہم سے ہمدردی کریں گے اور بیرونی خیالات چھوڑ کر وہ ہندستان کے ہو جائیں گے اگر یہ خیال ہی تو مسٹر گاندھی کا فعل بالکل عقل اور دُور اندیشی کے خلاف نہیں ہی۔

یہ چند خیالات ہیں جن کا ڈاکٹر کیتکر نے بار بار اظہار کیا ہی۔ اُن کے اکثر خیالات معمولی اور اوپری ہیں جن میں کوئی جدّت نہیں۔ اور جن میں کچھ جدّت ہی وہ بھُس بھُسے ہو کر رہ گئے ہیں۔ انھیں صاف گوئی کا دعویٰ ہی اور اسے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ ایک عرصہ ہوا کہ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مہاتما بدھ کی شان میں کچھ نازیبا کلمات لکھے تھے۔ بدھ مذہب کے ایک محقق اور عالم پروفیسر دھرمانند کوشامبی نے جواب میں صرف اس قدر لکھا تھا کہ کیتکر جیسے بہت سے اس دُنیا میں آئیں گے اور چلے جائیں گے اور کوئی ان کا نام بھی نہ جانے گا مگر مہاتما بدھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ہم اس موقع پر صرف ان الفاظ کا اعادہ کرنا کافی سمجھتے ہیں اور زیادہ بحث و تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ہم ڈاکٹر کیتکر صاحب کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک بڑے کام کا بیڑا اُٹھایا ہی اور فی الحقیقت مرہٹی زبان پر احسان کیا ہی کہ معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ مہیا کر رہے ہیں۔ دیسی زبانوں کو ترقی اور فروغ دینے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہی۔ ہم ان کی ہمت اور اولوالعزمی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں چند امور کے متعلق شکایت ہی جنھیں ہم مختصراً ذیل میں بیان کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آیندہ جلدوں میں اُن کے رفع کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

۱۔ پہلی جلد کا طرز تحریر بے مزہ، طولانی اور غیر مربوط ہی۔ بعض خیالات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہی۔ جن معلومات کی ضرورت تھی وہ رہ گئی ہیں اور ذاتی خیالات کو زیادہ ترجیح دی گئی ہی۔ انھیں ابواب میں اس قسم کی بحثیں آسکتی تھیں۔ جن کے پڑھنے سے ناظرین کی معلومات میں حقیقی اضافہ ہوتا مگر ان کا لحاظ نہیں کیا گیا اور زیادہ تر بحثیں اوپری اور اخباری طرز میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہی اس پر کوئی مستقل بحث نہیں کی گئی صرف ضمناً

بعض مقامات پر چند جملوں کے کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے ضرورت تھی کہ اس پر خاص مضمون لکھا جاتا اور وضاحت کے ساتھ اس پر بحث و تنقید کی جاتی۔ امید ہے کہ آیندہ کسی جلد میں مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

۳۔ اگر ہر باب اُس مضمون کے ماہر اور محقق سے لکھوایا جاتا تو کتاب کی وقعت بڑھ جاتی اور زیادہ مفید ہوتی۔

۴۔ بہت مناسب ہوتا اگر اس جلد کے دیباچے میں کتاب کا آیندہ پروگرام درج کیا جاتا نیز یہ بتایا جاتا کہ آیندہ جلدوں میں کن کن علما اور ماہرین فن سے مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ غرض کتاب کی ترتیب و تالیف اور انتظام کے متعلق کافی اور مفصل بحث ہونی چاہیے تھی۔

۵۔ اس جلد میں چند تصویریں بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ادنیٰ درجے کی ہیں اور بمبئی کے معمولی ناٹکوں کے فوٹوؤں سے لی گئی ہیں۔ علاوہ ادنیٰ درجے کی ہونے کے تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہیں۔ اس بارے میں اُن کا یہ عذر کہ ہمارا مقصد تصویروں سے کتاب کی خوبصورتی نہیں بلکہ مضامین کی وضاحت ہے قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

۶۔ کیا اچھا ہوتا اگر کتاب کے آخر میں مضمون نما (انڈکس) بھی لگا دیا جاتا۔

رسایل عماد الملک

نواب عماد الملک بہادر سی۔ایس۔آئی (مولوی سید حسین بلگرامی)

ملک میں اپنے تبحرِ علمی اور اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے خاص اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ جیسے عربی فارسی کے فاضل ہیں ویسے ہی انگریزی زبان کے بھی مستند ادیب ہیں اور اسی مناسبت سے مشرق و مغرب کے پسندیدہ خصایل اور ذوقِ تہذیب کا عمدہ نمونہ ہیں گو وہ مختلف عہدوں اور مختلف صحبتوں میں رہے مگر ان کی تمام عمر تعلیمی معاملات پر غور کرنے اور مطالعۂ کتب میں صرف ہوئی اور باوجودیکہ ان کی عمر اب اسّی سال کی ہو مگر وہی ذوق اب تک باقی ہو۔ ان کی صحبت بہت پُر لطف ہو۔ اکثر شعر و سخن اور علمی ادبی امور پر ذکر کرتے ہیں، عربی، فارسی، اُردو کے ہزارہا منتخب اور اعلیٰ درجے کے اشعار یاد ہیں جن سے اُن کے ذوقِ سلیم کا اندازہ ہوتا ہو۔ ان کی صحبت ایک ایسی تعلیم ہو جو آیندہ بہت کم نصیب ہوگی۔ اہلِ علم اور طلبا کے بہت قدرداں ہیں ایک پھٹے حال طالب علم سے مل کر وہ جس قدر خوش ہوتے ہیں اس قدر انھیں کسی امیر سے مل کر خوشی نہیں ہوتی ان کا مزاج بہت سادہ اور بے تکلف ہو۔ نمود و نمایش اور تکلف سے کوسوں دور ہیں صداقت شعاری میں وہ مشہور بلکہ بدنام ہیں۔ اپنی رائے ظاہر کرنے اور سچ بات کہنے میں کبھی نہیں چوکتے۔ خواہ ان کا مخاطب کوئی ہو۔ وضعداری ان میں ویسی ہی جیسی پُرانے لوگوں میں سُننے میں آتی تھی۔ اُن کا ذوق اِن تین چیزوں میں ہو۔ سادگی، صفائی اور حُسن۔ اب اس میں مادّی اشیا بھی آگئیں، ادب بھی آگیا، اور مذہب بھی۔ مذہب کا آج کل بڑا خیال ہو، اکثر اس کا چرچا کرتے ہیں اور اسلام کو بہترین مذہب مانتے ہیں۔ اور اس کی خوبیاں بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن

سے جوانی تک علمی مشغلہ رہا۔ علمی جلسوں اور علمی صحبتوں میں بسر ہوئی اور ملازمت بھی کی تو علم کی۔ گویا نسب بھی ان کا علم ہے اور حسب بھی علم۔ اور اب بھی علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

ان کا یہ علمی ذوق حظِ نفس اور لطفِ تخیل ہی تک نہیں رہا بلکہ علمی تحریکات میں بھی وقتاً فوقتاً شریک رہے۔ اور بعض کا وجود محض آپ کی تحریک سے عمل میں آیا۔ مثلاً انجمن ترقیٔ اُردو کا ابتدائی فروغ محض آپ کی توجہ و عنایت سے ہوا اور اب تک آپ اس کے صدر ہیں اور اس کے علمی اور ادبی معاملات میں برابر مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دار المصنفین بھی آپ کا زیر بارِ احسان ہے۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ان کے علمی مشوروں اور مالی امداد کی ممنون ہے۔ حیدر آباد کے دار العلوم کو محض آپ کی ذات سے رونق اور ترقی ہوئی۔ کتب خانۂ آصفیہ (حیدر آباد دکن) آپ ہی کا قایم کیا ہوا ہے جس میں آپ نے عربی، فارسی، اُردو کے نایاب قلمی نسخے بڑی تلاش سے جمع کیے۔ یہ ذخیرہ بہت قابلِ قدر ہے۔ دایرۃ المعارف آپ ہی کی تحریک پر قایم ہوا اور جو کچھ اس میں کام ہوا وہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے آپ ہی کی تحریک اور تحریر پر امیر خسرو کے کلام کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی حیدر آباد میں ملکی حرفت و صنعت کی ترقی میں ساعی رہے اور اس کے لیے مدارس قایم ہوئے۔ تعلیم نسواں کے آپ بہت بڑے حامی ہیں۔ حیدر آباد میں تعلیم نسواں کا جو چرچا ہے اور غالباً دوسرے مقامات سے یہاں جو تعلیم نسواں کو زیادہ ترقی ہوئی وہ آپ ہی کے حسنِ مساعی کا نتیجہ ہے۔ اب بھی تدوین و اشاعتِ کتب قدیمہ کا سررشتہ آپ ہی کو تفویض ہے۔ نادار اور ہونہار طلبا کو آپ ہمیشہ اپنی جیب سے وظیفے دیتے رہتے ہیں۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے سے کہتا ہوں کہ کوئی علمی ادبی یا تعلیمی یا کوئی مفید تحریک ہو آپ ان کے پاس لے جایئے وہ بڑی خوشی

سے اس میں شریک ہوں گے اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدد دیں گے۔

اس کے بعد ہمیں ان کی تحریریں پڑھنی چاہئیں۔ جو رسایل عماد الملک کے عنوان سے ابھی طبع ہوئی ہیں۔ اس میں کل ۱۹ مضامین ہیں۔ ان میں سے ۹ علمی مباحث پر ہیں ۲ اخلاقی ۲ زرعی ۴ تعلیمی اور ایک سیاسی امور پر ہے۔ ان سب میں قابل غور اور عالمانہ مضمون "دیسی زبانوں میں علمی مصطلحات" پر ہے۔ یہ مضمون پچاس صفحے پر ہے اور اردو کے پہلے نمبر میں شایع ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ پچاس سال قبل کا لکھا ہوا ہے لیکن باوجود اس کے خیالات کی جدت وتازگی کی وجہ سے اس وقت بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اور اس سے نواب صاحب کی علمی قابلیت اور ادبی ذوق کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ اب بھی اُسی قدر اہم اور قابل بحث ہے جس قدر پچاس سال پہلے تھا۔ اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں طور سے بحث میں آیا ہے۔ میرے خیال میں نواب صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامع حیثیت سے اس پر بحث کی ہے اور اس کی مشکلات پر نظر ڈالنے کے بعد اُسے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی زبان میں جدید علمی صطلاحات کے ترجمہ کرنے کے اصول قایم کیے ہیں۔ یہ موقع اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا نہیں ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ جو صاحب اِس مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں اُنھیں اس مضمون کا پڑھنا لازم ہے۔

تعلیمی مضامین درحقیقت ان کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس یا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس میں بحیثیت صدر فرمائی تھیں۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں ہیں جو تعلیم کے معاملے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ہم نوا اور ہم خیال تھے اور جو مغربی السنہ وعلوم کی تعلیم کو قوم کے تمام امراض کا علاج خیال کرتے تھے چنانچہ رام پور میں جو ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا

اس میں فرماتے ہیں :-

"علوم جدیدہ کی نسبت بھی بعض پُرانے فیشن کے لوگ جو کبھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ہیں لانسلّمہ کا کلمہ زبان پر لائیں گے مگر ہم کو اُن سے بحث نہیں ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر وہ حضرات جن کو اس کانفرنس کے اغراض سے دلچسپی ہے اس امر کو بطور اصول موضوعہ وعلوم متعارفہ مان لیں گے اگر ہم مسلمانوں کو اپنی قوم کی اصلاح اپنی دولت کی ترقی بلکہ اپنے نام و نشان کا بقا مدّ نظر ہے اور ہم اپنے آپ کو صفحہ ہستی سے مثل حرفِ غلط محو کر دینا پسند نہیں کرتے ہیں تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یورپ کی زبانیں سیکھیں اور یورپ کے علوم حاصل کریں۔ آج کل بغیر علم موجودات عالم کے کوئی کام دُنیا کا پورا نہیں ہو سکتا صنعت و حرفت، تجارت، نوکری، طبابت وکالت، سپہ گری کسی فن میں بغیر جدید علوم کی مدد کے ہم ترقی نہیں کر سکتے اور یہ علوم بغیر انگریزی کی میانجی گری کے سردست حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم انگریزی زبان کو اچھی طرح حاصل کریں تاکہ مغربی علوم کے خزانے کی کنجی ہمارے ہاتھ آجائے۔"

لیکن وہ موجودہ تعلیم کے نقائص سے بھی ناواقف نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد فرماتے ہیں :-

"جو لوگ اس طریقۂ تعلیم کے بڑے طرف دار ہیں وہ معترف ہیں کہ یونیورسٹیوں کی مجوزہ تعلیم بہت کچھ اصلاح کے لایق ہے اور اس تعلیم سے اخلاق پر اور نفس انسانی کے اعلیٰ جذبات پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عمدہ تعلیم کا جزوِ اعظم ہے اور نہ خود السنہ و علوم مغربی پر سوائے ایک سطحی اطلاع کے عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ الّا ماشاء اللہ موجودہ تعلیم سے اس وقت تک نہ کوئی بڑا عالم یا مدبر یا حکیم مسلمانوں میں پیدا ہوا اور نہ ہونے کی امید ہے نہ سر سالار جنگ مرحوم اور نہ سرسید احمد خاں مغفور اسکولوں کے تعلیم یافتہ

تھے کیونکہ اس تعلیم کا دارومدار امتحانوں پر ہی اور امتحانوں کی بھرمار سے بالاضطرار نہ
کہ بالاختیار بہت سے منافذ علمی روشنی کے ہمارے لیے مسدود ہو جایا کرتے ہیں
اور ایک بڑا ناقابل برداشت عیب اُس تعلیم میں یہ ہی کہ اپنے مذہبی عقاید و مسایل اور
اپنی ملت کی مقدس تاریخ سے ہمارے نوجوان گویا بالکل اجنبی رہ جاتے ہیں۔
...... دوسرے تعلیم میں اصلاحوں کی بھی کوئی قریب توقع نہیں ہی اور اگر بوفرضنا
اصلاح کی بھی جائے تو کیا معلوم ہی کہ ہماری مرضی کے موافق ہی ہوگی ہم اپنی
قومی ضرورتیں خود بہتر جانتے ہیں۔"

اِسی تقریر میں انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے قیام پر بھی بحث کی ہی
اور یہ بتایا ہی کہ صرف ایک کالج ترقی کر کے یونیورسٹی بن سکتا ہی۔ قرطبہ اور بغداد
کے مشہور مدارس کو بھی ایک زمانے میں یہی فخر حاصل تھا۔ ڈبلن یونیورسٹی کی بنیاد
بھی صرف ایک کالج پر ہی۔ اِسی طرح علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے میں کوئی
امر مانع نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی درس گاہ ترقی کرتا ہو تو ایک حد سے گزرنے
کے بعد خود بخود یونی ورسٹی کی حیثیت پیدا کر لیتا ہی۔ اور اس قدر ترقی کے اسباب مہیا
کرنا بالکل قوم کے ہاتھ میں ہی۔ یعنی مختلف علوم کے درس کا سامان مہیا کرنا، ہر علم کے
لیے ایسے ماہر مدرسین کا مقرر کرنا جن کے نام ہی سے شایقینِ علم ان کے درس میں
شریک ہونے کی آرزو کریں۔ اعلیٰ درجے کے کتب خانے اور تجربہ خانے کا مہیا
کرنا وغیرہ۔

اسی ضمن میں وہ فرماتے ہیں کہ :۔

"اس تجویز پر نکتہ چینی کی ہی کہ کسی خاص مذہب کی قید کے ساتھ کسی یونیورسٹی
کا قایم ہونا مفید نہ ہوگا۔ یونی ورسٹی کا دایرۂ افادہ وسیع ہونا چاہیے، کسی ملت و
مذہب کی خصوصیت نہ ہونی چاہیے ورنہ خیالات محدود اور تعصبات غالب ہو جائیں گے۔

جن سے بچنا ترقیِ علم کے لیے لازمی اور لابُدی ہے۔ میں اس اعتراض کو ایک حدتک تسلیم کرتا ہوں۔ سید صاحب مرحوم نے اِسی لیے علی گڑھ کالج کا دروازہ ہر ملت و مذہب کے لیے کشادہ رکھا تھا اور اب بھی کشادہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ کشادہ نہ رہے میری ذاتی رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندستان کے لوگ جو ایک ملک کے رہنے والے ایک بادشاہ کی رعیت ایک قانون کے پابند ہیں، اُن میں اتحاد و اتفاق رہنا چاہیے اور برادرانہ برتاؤ ہونا چاہیے۔ گو ملت و مذہب علیحدہ ہو۔ نظرِ حقیقت بیں کے آگے ہندو مسلمان، یہودی، عیسائی سب راہِ حق کے جویاں ہیں۔ فقط عقاید اور طرق مختلف ہیں۔ دیکھیے قرطبہ کی یونی ورسٹی میں نصرانی طالبِ علم کس قدر موجود تھے پس اگر ہماری یونی ورسٹی کا دروازہ بھی ہر ملت و مذہب کے واسطے کشادہ رہے تو میری رائے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ ایک نوع سے خود مسلمان طلبا کے حق میں مفید ہوگا کیونکہ انصافاً ہمارے ہندو بھائی محنت و مشقت میں اور طالب علمی کی نفس کشی میں ہم سے بہت پیش قدم ہیں اور ہم کو اُن کی صحبت سے غبطہ کا فایدہ پہنچ سکتا ہے"۔

اِس یونی ورسٹی میں انھوں نے دینیات کی فیکلٹی قایم کرنے کی بھی رائے دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"مختصر ہم یونی ورسٹی سے اپنی دو نہایت مہتم بالشان غرضیں پوری کرایا چاہتے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان لڑکا اپنے مذہبی عقاید و مسایل سے ناواقف نہ رہے اور اپنے بزرگان دین کی تہذیب و اخلاق سے عاری نہ ہو اور اُس کے ساتھ ہی مغربی علوم پر جامعیت کے ساتھ عبور حاصل کرے اور مغربی خیالات سے پورے طور پر متمتع ہو۔ دوسری غرض یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹی ایک ایسا مرکز علوم و فنون بن جائے کہ اُس کا اثرِ صالح تمام ہندستان کے مسلمانوں پر پڑتا رہے اور اُن کے

خیالات کی اُن کے طرز معاشرت کی اور سب سے زیادہ ان کے لٹریچر کی اصلاح

کرے۔ آپ بے خبر نہیں ہیں کہ علی گڑھ نے اور تہذیب الاخلاق نے تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے لٹریچر پر کیا اثر ڈالا تھا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اُردو زبان کی کتابیں اس بیس سال کے عرصے میں تصنیف ہوئی ہیں وہی قابل اعتنا نکلیں گی جن پر علی گڑھ کے طریقۂ تحریر کا اثر پڑا ہی ورنہ بہت سی ناولیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے اکثر یا تو مادہ سے خالی ہیں یا اُس بیہودہ اور غیر مہذب رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جس کی ہماری پبلک بعض خاص خاص سوسائٹیوں کے پلید اور چرک آلود اثر سے عادی ہو رہی تھی۔ عاقل کے لیے اشارہ کافی ہی۔ اگر فسانۂ عجایب سے لے کر اس وقت کی ان ناولوں تک جو اپنے مصنّفین کے نزدیک بہت مہذّب طور پر لکھی گئی ہیں غور سے نظر ڈالی جائے اور خاص کر اس نکتے کی طرف توجہ کی جائے کہ اُن میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا گیا ہی تو آپ پر حقیقت کھُل جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ان میں یورپ کی بدترین اور ذلیل ترین ناولوں کی تقلید کی گئی ہی اور اُس کا نام تہذیب رکھا گیا ہی۔ باقی باتیں وہی قایم ہیں جو پچھلے وقتوں سے وراثتاً ان کو ملی ہیں۔ ہم کو پورا یقین ہی کہ اگر یونی ورسٹی قایم ہو گئی تو تو بہت جلد یہ دھبّہ ہمارے موجودہ لٹریچر سے مٹ جائے گا اور قابل قدر کتابوں کی تعداد بڑھتی جائے گی اور مصنفین کے تفکّرات و تخیّلات میں اصلاح ہو جائے گی۔

یہ خیالات بیس برس پہلے کے ہیں مگر اب بھی ان میں تازگی موجود ہی۔ اور ہمارے حالات پر صادق آتی ہیں۔ علی گڑھ یونی ورسٹی قایم ہو گئی ہی۔ دیکھیں وہ ان توقعات کو کہاں تک پورا کرتی ہی اور خاص کر اُردو زبان کی اصلاح و ترقی میں کیا کیا کوششیں عمل میں لاتی ہی۔ یہ توقع ہمیں زیادہ تر عثمانیہ یونیورسٹی سے ہی جس کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ہم دوسری قومی اور نیم قومی یونی ورسٹیوں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ کیونکہ جب تک علوم و فنون اپنی زبان میں نہ آئیں گے،

ملک میں علم کی عام اشاعت نہیں ہو سکتی۔ اور اس روشنی میں بھی یہ تاریکی یوہیں رہے گی۔

افسوس ہو کہ اس مجموعے میں نواب صاحب کا عالمانہ مضمون "مسلم یونیورسٹی" پر داخل نہیں کیا گیا حالانکہ اُسی زمانے میں اُس کا ترجمہ بھی شایع ہو گیا تھا۔

علمی مضامین میں (علاوہ مضمون اصطلاحات کے) ابن رشد اور اس کے ہم عصروں پر بہت بڑا مضمون ہو جو (۷۸) صفحوں پر ختم ہوا ہو۔ ایک اور مضمون ہوا؛ پانی پر تقریباً دس صفحے پر ہو۔ اس کا تعلق سائنس سے ہو۔ اگرچہ یہ مضمون اس زمانے میں بہت زیادہ قابل قدر نہ خیال کیا جائے گا لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہو کہ نواب صاحب کو اپنی زبان کی ترقی کا کس قدر خیال تھا کہ انھوں نے پچاس سال قبل اس قسم کے مضمون لکھ کر ملک میں شایع کیے۔ یہ مضمون اب بھی پڑھنے کے قابل ہو۔ ایک مضمون سقراط پر مسجّع اور مقفّیٰ عربی میں لکھا ہو۔ جو اس مجموعے میں شریک ہو۔ تین مضمون زراعت پر ہیں جن کا پڑھنا اُن لوگوں کے لیے دل چسپی اور فایدے سے خالی نہ ہوگا جو اس فنِ شریف سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر ہر مضمون کے ساتھ اس کا سنہ تحریر بھی لکھ دیا جاتا۔

نواب صاحب کا سب سے قابلِ قدر کام قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہو جو سولہ پارے تک ہو چکا ہو۔ افسوس ہو کہ اب اِس کی تکمیل کی توقع نہیں معلوم ہوتی۔ انگریزی میں قرآن پاک کے متعدد ترجمے موجود ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے نواب صاحب کا انگریزی ترجمہ دیکھا ہو اور صاحب بصیرت ہیں اُن کا خیال ہو کہ ان ترجموں کو اِس سے کوئی نسبت نہیں۔

اِسی مجموعے میں ایک خط سر سید احمد مرحوم کے نام نیشنل کانگریس کے متعلق ہو۔ نواب صاحب ہندستان کی سیاسیات میں سر سید احمد مرحوم سے بالکل متفق

تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، زمانے نے دوسری کروٹ لی ہے۔ معاملات کی نوعیت دگرگوں ہو گئی ہے۔ اب اُس زمانے کے خیالات کا اس زمانے میں اعادہ کرنا عبث ہے۔ نواب صاحب اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت کا ابتدائی زمانہ دیکھا تھا اور جو انگریزوں کی قوت ایجادات و اختراعات اور انصاف سے مرعوب ہو گئے تھے اور ان کو دنیا کی بہترین قوم تصور کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی معاشی (اقتصادی) نقطۂ خیال سے اُن کے اصولِ حکومت پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی تھی۔ یہ چیزیں اب تاریخی لحاظ سے یادگار رہیں گی۔

روحِ سیاست

ڈراما

(مترجمہ جناب محمد عمر و نور الٰہی صاحب)

ڈراما - اصناف ادب میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ رکھتا ہے۔ عمدہ ڈراما ادبی کمال، تخیل کی رفعت اور انسانی فطرت کے مطالعے کی بہترین مثال ہے اور انسانی دل و دماغ اور اخلاق پر اثر ڈالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں افسوس ہے کہ ہمارا علم ادب اعلیٰ درجے کے ناٹکوں سے خالی اور ملک اس نعمت سے محروم ہے۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ دو قابل اور مستعد نوجوانوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ دُنیا کے بہترین ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کر کے ملک میں شایع کریں گے۔ جن میں سے ایک جو زیر تبصرہ ہے شایع ہو چکا ہے اور دو ایک طبع کے لیے تیار ہیں۔ اِن صاحبوں کی یہ ادبی کوشش نہایت قابلِ قدر ہے اور ہم انھیں اِس پر دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلے کو اسی مستعدی سے جاری رکھیں گے اور کسی رُکاوٹ یا مزاحمت سے بد دل یا پست ہمت نہ ہوں گے۔

روحِ سیاست - ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس کی انگلستان میں بے حد قدر و منزلت ہوئی۔ ایک تاریخی اور سیاسی ڈراما ہے۔ جس میں بنی نوع انسان کے محسن اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شریف پریزیڈنٹ ابراہام لنکن

---

[1] یہ کتاب جناب محمد عمر صاحب مترجم ہائی کورٹ جموں (کشمیر) سے مل سکتی ہے۔
قیمت نامعلوم تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۴۵۔

کی حیات ابدی کی صحیح جھلک نظر آتی ہے۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب کہ جنوب اور شمال میں مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بنائے مخاصمت غلامی تھی۔ اہل جنوب غلامی سی عزیز شے کو جس پر ان کی دھن دولت اور تمول کا انحصار تھا، چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور اس لیے شمال سے آزاد رہ کر اس سے تمتع حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس باہمی جنگ اور مخالفت نے تمام امریکہ میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نازک اور انقلاب خیز وقت میں ابراہام پریزیڈنٹ انتخاب کیا گیا اور باوجود اختلاف رائے، مزاحمتوں اور سازشوں کے اس نے وہ کام کیا جس پر انسان اور ملائکہ ہمیشہ رحمت بھیجتے رہیں گے۔ وہ بے حد مستقل مزاج، اصول کا پکا، سیدھا سادا اور صاف سچا آدمی تھا۔ وہ امریکہ کے اتحاد کے قیام اور غلامی کے مٹانے پر مُصر تھا۔ اگرچہ بہت سے مصایب و آلام نازل ہوئے کشت و خون ہوا، قتل و غارت گری کرنی پڑی (جس سے وہ سخت متنفر تھا مگر مجبور تھا) مگر وہ آخر کامیاب ہوا۔ اس نے امریکہ میں اتحاد قایم رکھا اور غلامی کو دنیا سے مٹا کر چھوڑا۔ جس روز وہ فتح پاتا ہے اور اُسے اپنے پاک عزم میں کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ ایک مشہور تھیٹر میں جاتا ہے خلقت کا ہجوم ہے اور سب کی نظریں اسی نیک نفس انسان پر ہیں اور ہر طرف سے اصرار ہے اور آوازیں بلند ہیں کہ پریزیڈنٹ تقریر کرے کہ دفعتاً اس بھرے تھیٹر میں ایک بدبخت نادان نوجوان کے ہاتھ سے قتل ہوتا ہے۔ سارے تھیٹر میں کہرام مچ جاتا ہے اور وہ شرافت و نیکی کا پُتلا وہیں جان دے دیتا ہے۔ مگر وہ زندۂ جاوید ہے، وہ محسن وطن ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کا محسن ہے۔

اِس قسم کے ڈراموں کی ہمارے ملک کو شدید ضرورت ہے۔ پند و موعظت اور لکچر، مجلسوں کی رودادیں اور پمفلٹ وہ کام نہیں کر سکتے جو ایک ڈراما کر دکھاتا ہے بشرطیکہ اس کا لکھنے والا صاحب نظر اور ادیب ہو اور اِس فن کو سمجھتا ہو۔

قابل مترجمین نے دیباچے میں لکھا ہے کہ :-

"گو یہ کتاب مطالعے کے لیے بھی خوب ہے مگر دراصل اس کا اسٹیج پر لانا مقصود ہے۔ اس کا حُسن و قبح اسٹیج ہی پر معلوم ہوگا۔"

یہ صحیح ہے، لیکن اعلیٰ درجے کے ڈرامے مطالعے میں بھی بہت موثر ہوتے ہیں رُوحِ سیاست کا شمار اُن ڈراموں میں نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک سیدھا سادا ڈراما ہے جس میں نہ کوئی بڑی پلاٹ ہے اور نہ اشخاص ڈراما کی شخصیتوں کے اُبھارنے اور ممتاز طور پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ ابراہیم لنکن کی شخصیت تو ایسی ہے جس کا اثر خود بخود انسان پر پڑتا ہے مگر باقی اشخاص کم و بیش معمولی نظر آتے ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو دل یا حافظہ پر اپنا نقش قایم کرسکے۔ حالانکہ کئی جگہ اس کا موقع تھا مثلاً غلامی کے حامیوں کی جانب سے کوئی شخص ایسا پیش نہیں کیا گیا جو اپنے گروہ کے خیالات و جذبات کا صحیح اظہار کرتا یا مثلاً ڈگلس حبشی کی ملاقات (لنکن سے) زیادہ موثر ہوسکتی تھی جس میں انسانی فطرت کے کرشمے زیادہ خوبی کے ساتھ نظر آسکتے تھے بہرحال اُردو کے لیے یہ ڈراما بھی بہت غنیمت ہے اور اگر ہمارے ہاں کا کوئی تھیٹر اس کے مناسب حال انتظام کرکے اسٹیج پر لائے اور ان ہدایتوں کو مدنظر رکھے جو مترجمین نے اپنے دیباچے میں لکھی ہیں تو امید ہے کہ ہمارے ناٹکوں میں بہت کچھ اصلاح ہوجائے اور دیکھنے والوں کے مذاق پر بھی اثر پڑے۔ مترجمین اپنے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"یہ کتاب دو جداگانہ ڈراموں پر مشتمل ہے جن کی پلاٹ کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ ہر دو ڈرامے ایک ہی وقت میں اسٹیج پر آئیں گے اور ان کے سین یکے بعد دیگرے یا جس طرح اسٹیج کی سہولت اجازت دے دکھائے جائیں گے۔"

یہ دوسرا ڈراما جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، **جانِ ظرافت** ہے، جو فرانس

کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی تصنیف ہے۔ غالباً اسے ساتھ اس لیے رکھا گیا ہے کہ تماشائیوں کی دل چسپی قایم رہے۔ افسوس ہے کہ وہ ہمارے پاس نہیں آیا۔ لہذا ہم اس کے ترجمے کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے۔

مترجمین نے اس ترجمے میں اکثر مقفےٰ عبارت لکھی ہے۔ اُن کے خیال میں اس کا استعمال بمجبوری اس لیے جائز رکھا گیا ہے کہ ہماری زبان میں بلینک ورس (نظم غیر مقفےٰ) کا رواج نہیں۔ اور یہ مجبوری اس لیے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے لیکن یہ ضرور ہے کہ مقفےٰ گفتگو عام بول چال کے خلاف ہے۔ حالانکہ ڈراما اصل کی سچی نقل ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات گفتگو یا عبارت کے جملے بھدّے، بھونڈے اور مہمل ہو گئے ہیں یا اصل خیال صحیح طور سے ادا نہیں ہوا اور اس کی قوت کم ہو گئی ہے۔ مثلاً

"اور مجھ پر ذمّہ داری کا یہ بار ڈالا جس سے واشنگٹن کو بھی نہ پڑا پالا۔"

سیورڈ۔ "بندہ معافی کا خواستگار ہے۔"

لنکن۔ "یہی جوہر انسانیت کا سنگار ہے۔"

"قانون کیا ہے؟ محض مختلف رایوں کا مجموعہ، آپ جانتے ہیں اور اہل جنوب تو اسے بخوبی مانتے ہیں۔"

لنکن۔ "سکاٹ کہتا ہے کہ بیس ہزار سے ایک بھی کم سپاہی درکار نہیں۔"

سیورڈ۔ "اور یہاں دس ہزار بھی تیار نہیں۔"

"کونسل کے ایک ہی ممبر پر ان کی حکمت عملی کا مدار ہے اور یہ کھلا ہوا راز ہے کہ وہ ممبر سیورڈ نامدار ہے۔"

"یہ میرے صادق دوستوں کی رفاقت کا جام ہو جن کی محبت کا یہ دشمن بردہ فروشی ناخریدہ غلام ہو۔"

بعض مقامات پر زبان کی خامیاں بھی رہ گئی ہیں اور یہ ڈرامے کے لیے بہت نازیبا ہو۔ کیونکہ سُننے والوں کے کانوں کو یہ ناگوار گزرتی ہیں اور ان سے ڈرامے کا اثر کم ہو جاتا ہو۔ مثال کے طور پر چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں :-

کئی جگہ مسز لنکن کو "جنابہ" سے خطاب کیا گیا ہو حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

ایک لیڈی مسز لنکن سے ملنے آئی ہو اور ملنے کے کمرے میں بیٹھی ہو۔ خادمہ آکر اطلاع دیتی ہو کہ :-

"ایک لیڈی صاحبہ مدت سے منتظر ہیں" (مطلب یہ ہو کہ بہت دیر سے منتظر ہیں)

"یہ تو جنگ ہو، میں نے اسے خون کا مقدمہ نہیں بنانا"

"اُس نے فردِ حساب تیار کر لیا ہو" (فرد مؤنث ہو)

"جب باغی فوج میرے لینڈ سے نکل جائے"

یہ بہت مکروہ لفظ ہو۔ اور جب ہماری زبان میں اس کے لیے متعدد لفظ موجود ہیں تو کیوں یہ انگریزی لفظ استعمال کیا گیا ہو۔

"اُنھیں سلام دو" یہ اینگلو انڈین محاورہ ہو، فصیح اُردو نہیں ہو۔

"حضرات! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تشریف رکھیے"۔ یہ انگریزی جملے کا لفظی ترجمہ ہو۔ اُردو میں اس طرح نہیں کہتے۔

ڈراما ادبی نقایص سے بری ہونا چاہیے۔ ہم نیک نیتی سے مترجمین کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اِس معاملے میں بہت احتیاط کریں اور بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے ترجمے کسی قابل ادیب کو دکھا لیا کریں۔

بہرحال ہم ان دونوں صاحبوں کے بہت ممنون ہیں اور ان کی کوششوں کو بہت وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اُردو زبان کی بہت بڑی کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ اور آیندہ وہ دُنیا کے بڑے بڑے اساتذہ اور اعلیٰ درجے کے ڈراما نویسوں کی تصانیف کا ترجمہ کرنے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کو اپنے حالات سے اپنے ڈرامے خود لکھنے چاہئیں مگر ہمارے ملک کی حالت اس وقت ایسی ہو کہ اُسے اعلیٰ تصانیف کے ترجمے کی شدید ضرورت ہو تاکہ اہل ملک کے سامنے بہترین نمونے موجود ہوں۔ اُن میں ذوق سلیم پیدا ہو اور عمدہ تصانیف کی ترغیب و تحریک ہو۔ ایک مبتذل اور ادنیٰ درجے کی تصنیف سے ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف کا ترجمہ بدرجہا بہتر ہو۔ جن اساتذہ کے نام انھوں نے ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں اُن کی تصانیف تمام عالم میں مسلّم اور مقبول ہیں اور اُن کے ترجمے سے بلاشبہ ہماری زبان میں بیش بہا اضافہ ہوگا اور اُردو داں طبقے کو بہت بڑا فایدہ پہنچے گا۔ لیکن آخر میں ہم اتنی التجا کرتے ہیں کہ یہ ترجمے ادبی لحاظ سے بھی بے عیب ہونے چاہئیں۔

حزنِ اختر

اودھ کے آخری تاج دار سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر کی ایک مثنوی ہو
جس میں شاہ مرحوم نے زمانۂ قید کلکتہ کے حالات اور مصایب تحریر فرمائے ہیں بقول
مولانا عبدالحلیم صاحب شرر "یوں تو یہ مثنوی ایک شاعرانہ کلام ہو۔ مگر در اصل
شاہ جنت آرام گاہ کی 'آٹو بیاگرفی' یعنی خود اپنی سوانح عمری کا ایک دردناک
ٹکڑا ہو۔ مولوی محبوب علی صاحب ناظم دایرہ ادبیہ قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے
اس شاہ بیتی کو جو مرحوم بادشاہ نے اپنے خونِ جگر سے لکھی تھی گمنامی سے نکال کر
عام طور پر شایع کر دیا۔

یہ مثنوی چھوٹی سی تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہو۔ شروع میں مولانا شرر صاحب
کا بہت دل چسپ مقدمہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہو کہ مولانا سے بہتر اس پر کوئی مقدمہ نہیں
لکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مولانا نے اس مظلوم بادشاہ کی آخری شان اور مٹیا برج کی صحبتوں
کے رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ گو بادشاہ قید فرنگ میں تھے مگر ان کے
قدموں کی برکت سے مٹیا برج خود ایک نیا لکھنؤ بن گیا تھا اور سچ یہ ہو کہ لکھنؤ کا جسم
تو اودھ میں تھا مگر اس کی جان مٹیا برج میں تھی۔ وہی صحبتیں وہی جلسے وہی شعر و
شاعری اور عمارت کا شوق وہی دربار اور تکلفات جو بادشاہی میں تھے۔ اس قید
فرنگ میں بھی نظر آتے تھے کس قدر افسوس اور حیرت کا مقام ہو کہ لارڈ ڈفرن جیسے
ہوش مند مدبر نے مٹیا برج کے تمام عالی شان قصر و عمارت، وہاں کے دل فریب چمن
چڑیا گھر اور ڈیوڑھیاں گرا کر خاک میں ملا دیں ہم اسے کیا کہیں! مگر خود انھیں کے
ہم سر و ہم شعار فرمائیں کہ اسے کیا کہتے ہیں؟

جب ۱۸۵۷ء کی مشہور فوجی شورش ہندستان میں نمودار ہوئی تو انگریزوں کو اس اسیر بادشاہ پر بھی سازش کا شبہ ہوا حالانکہ یہ اُن کے وظیفہ خوار تمام معاملات سے بے خبر وطن سے دُور پڑے تھے مگر شبہ سے نہ بچ سکے۔ بادشاہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ علاج سے جب شفا پائی تو غسل صحت ہوا۔ مبارکبادی اور سلامتی کا غل ہونے لگا۔ شب کو بزم طرب جمی۔ ناچ گانا اور جلسہ رہا۔ چار گھڑی رات باقی تھی کہ جلسہ برخاست ہوا سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے سے جا کر سو رہے۔ ابھی بادشاہ آرام فرما رہے تھے کہ داد فریاد اور دہائی کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یکایک بادشاہ خواب راحت سے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ کوٹھی کو گورا فوج نے گھیر رکھا ہی۔ آخر گورنر جنرل کے سکریٹری آئے اور کہا کہ سرکار کو کچھ شبہ سا ہو گیا ہی۔ اس لیے یہ حکم ہوا ہی کہ آپ کچھ دنوں قلعے میں قیام فرمائیے۔ بادشاہ نے ہرچند اپنی بے گناہی ثابت کی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ صرف آٹھ مصاحبوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت دی گئی۔ نوکر چاکر سب ملا کر انتیس آدمی ہمراہ گئے۔ قلعہ (فورٹ ولیم) کا جو قلمی دروازہ تھا وہاں ان سب کو پہنچا دیا۔ آٹھ روز تک وہاں رہے بعد ازاں قلعے میں جو کوٹھی تھی وہاں قیام کا انتظام کیا گیا۔ یہ مثنوی اسی قید کا رونا ہی۔ وہاں جو جو بیتی یہ اس کا کچّا حال ہی بادشاہ کو اپنی بیگمات کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ پھر اس پر بعض مصاحبوں اور بیگموں کی بے وفائی، ملازموں کی شوخ چشمی اور شورہ پشتی، پہرہ کے گوروں کی بدسلوکی اور طرح طرح کی تکلیفوں نے زندگی تلخ کر دی تھی۔ غرض اس زمانے کی پوری کیفیت اس میں درج ہی۔

نظم سیدھی سادی ہی اور ان تکلفات سے بری ہی جو اُس وقت لکھنؤ کی شاعری میں عام طور سے پائے جاتے تھے۔ اپنے دلی جذبات اور حالات کو بے تکلف بیان کر دیا ہی۔ یہ بات کچھ چھپی ہوئی نہیں کہ واجد علی شاہ کو ادب و شاعری کا ذوق تھا

لیکن بادشاہوں کا جیسا کچھ ذوق ہوتا ہو وہ بھی معلوم ہو۔ مولانا شرر نے اپنے مقدمے میں اس معاملے کو صاف کر دیا ہو۔ اور بہت خوبی سے یہ ثابت کیا ہو کہ "واجد علی شاہ کا کلام بُرا بھلا جو کچھ ہو خاص ان کا ہو۔ اس میں ایک حرف بھی کسی اور کا نہیں ہو"۔ اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ "اصلی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کبھی کسی سے اصلاح یا مشورہ نہ لیتے تعلیم و اصلاح کا زمانہ لکھنؤ ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ مٹیا برج میں وہ اُستاد بلکہ اُستادِ کل تھے۔ ذہن میں یہ جمی ہوئی تھی کہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ جتنے شعرا و اساتذہ ملازم تھے سب شاگرد سمجھے جاتے، وہ شرف شاگردی حاصل کرنے کی درخواست کرتے بہ عنایت شاہی یہ عزت ان کو دی جاتی اور ایک مہر عطا ہوتی جس میں نام و خطاب کے ساتھ الفاظ "تلمیذ السلطان" بھی کندہ ہوتے۔ یہی اُستادی کلام میں لغزشوں کے رہ جانے کا باعث ہوتی۔ اور قیامت یہ تھی کہ دربار والے چاہے کتنے ہی صاحبِ کمال شاعر ہوں بجائے تنبیہ کرنے کے لغزشوں پہ بے حد داد دیتے، لیکن اور جس قسم کی لغزش چاہے ہو جائے یہ ممکن نہ تھا کہ کبھی کوئی مصرع غیر موزوں رہ جائے یا بحر سے الگ ہو اور یہ ان کی کمال موزونیٔ طبع کی دلیل ہو"۔

مولانا کی یہ رائے بالکل دُرست ہو جس کا ثبوت اس مثنوی کے مطالعے سے بھی ملتا ہو۔ گو اس مثنوی کا درجہ بلحاظ شاعری کے اعلیٰ نہ ہو مگر ایسی یادگار ہو جو ہم اہلِ ہند کو نہایت عزیز ہو اور علاوہ شاعری کے تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہو اور اُس زمانے کو یاد دلاتی ہو جو ہمارے اخلاقی سیاسی زوال کا کمال تھا۔
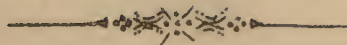
جواہراتِ حالی

اِس مجموعے میں مولانا حالی مرحوم کا وہ کلام ہے جو کبھی ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپا اور پھر شایع نہیں ہوا اور اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا یا وہ نظمیں ہیں جو اب تک کبھی شایع نہیں ہوئیں اور مولانا کے مسوّدوں یا اُن کے بعض احباب سے ملی ہیں۔ بڑی چھوٹی کل نظمیں ملاکر ۹۴ ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کی یہ تجویز تھی کہ مولانا کے کلام کا ایک عمدہ نسخہ کئی جلدوں میں طبع کیا جائے اور اِس کے لیے اُن کا وہ کلام جمع کیا جا رہا تھا جو اب تک شایع نہیں ہوا۔ ہم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکریٹری اور ٹیل پبلک لائبریری پانی پت کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری محنت کو ہلکا کر دیا اور جہاں تک ممکن ہوا نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اس مجموعے میں ایک جگہ جمع کر دیا۔ شیخ صاحب کا یہ کام بہت قابلِ قدر اور لایق تشکر ہے۔ شروع میں لایق مرتب نے مولانا کی شاعری اور ان کی تصانیف پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔

مولانا حالی کے کلام کے متعلق کچھ کہنے سننے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ جلسے ابھی ابھی درہم برہم ہوئے ہیں جہاں اُن کے پُر درد اشعار نے بھری مجلسوں کو تڑپا تڑپا دیا تھا اور اچھے اچھے ضابط اپنے دلوں پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ مولانا نے اُردو ادب اور شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ لوگوں کے خیالات اور دل و دماغ میں بھی ہل چل پیدا کر دی تھی، ان کا نقطۂ نظر بدل دیا تھا اور ان کے غور و فکر کے لیے ایک نئی راہ پیدا کر دی تھی۔ ان کے کلام کی حلاوت، زبان کی فصاحت اور بیان کی قوت ایسی تھی کہ بڑے بڑے منکر بھی آخر کو مان گئے اور سیکڑوں اس رستے پر پڑ لیے۔ بڑے بڑے ثقات جنھوں نے ایک کے سوا دوسرا سبق نہیں پڑھا تھا،

وہ کہنہ مشق شعرا جنھوں نے اپنے کوچے سے کبھی قدم باہر نہ رکھا تھا، اس اثر سے نہ بچ سکے، گو خود انھیں نہ معلوم ہوا کہ یہ اثر کہاں سے پہنچا اور یہ تغیر کیونکر پیدا ہوا
آج جو ہم اُردو ادب اور خاص کر شاعری میں خیالات کی جدت، بیان کی صفائی اور زور دیکھتے ہیں وہ سب مولانا کا طفیل ہے۔ چونکہ اُن کے کلام میں درد اور خداداد تاثیر بھی اس لیے بے حد مقبول ہوگیا اور اس عام مقبولیت نے ادب شاعری میں بہت جلد انقلاب پیدا کر دیا۔ مولانا کا کلام اُردو میں کلاسک یعنی ادبیاتِ عالیہ کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسی تاریخی چیز ہوگئی ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔

اس مجموعے میں زیادہ تر مولانا کے دورِ آخر کا کلام ہے جو حکیمانہ رنگ رکھتا ہے، لیکن زبان کا سچا ذوق اور بیان کا خاص انداز ان میں بھی ویسا ہی پایا جاتا ہے جیسا پہلی نظموں میں بلکہ پختگی اور الفاظ کے خاص خاص استعمال میں ترقی نظر آتی ہے۔ اس مجموعے کے دیکھنے سے اکثر لوگوں کو یہ بات نئی معلوم ہوئی کہ مولانا نے چھوٹے بچّوں کے لیے بھی نظمیں لکھی تھیں۔ یہ زیادہ تر مسٹر نولٹن پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی فرمایش پر لکھی گئیں۔ یہ نظمیں بہت صاف سیدھی سادی ہیں۔ لیکن اصل شے جو دوسری جگہ ڈھونڈھے سے نہیں ملتی وہ درد ہے جو اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں یا تو یہ میر کے حصّے میں آیا ہے یا حالی کے حصّے میں۔ مولانا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیاں بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو دنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسی مجموعے میں ایک نظم ہے جو انھوں نے بمبئی کی کانفرنس میں پڑھی تھی۔ اس کے ایک بند میں یہ بیان کیا ہے کہ خود تنزل ہی ترقی کا سرچشمہ ہے۔ ایک کا تنزل دوسرے کا عروج ہے ؎

کوئی یہاں بنتا نہیں جب تک نہ بگڑے دوسرا　　گھانس کھُد جاتی ہے جب پڑتی ہے تب کھیتی میں جان

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اُڑنے لگی
تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرتِ باغِ جناں

چھپے مرغِ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں

جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب
جب سنو یارو بگڑتا کوئی گھر یا خانداں

آسماں سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا
ہے وہی اک چیز، کل مہماں یہاں تھی آج واں

.. ..

قصرِ ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو
عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں

یاد رکھو! ہوں گے اب حقدار اُن کے جانشین
ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائیگاں

.. ..

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو!
تم کو فرصت ہے، لٹاؤ وقت و دولت رائیگاں

دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز
ہیں تمھارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں

مت کرو شکوہ مشیّت کا خدا ظالم نہیں
بلکہ ظالم ہیں تمھاری اپنی بد اعمالیاں

یہ ہے قانونِ الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں
گو جگہ سے اپنی ٹل جائیں زمین و آسماں

انجمن موید الاسلام دہلی کے لیے "امداد یتیمان" پر ایک بہت پُر درد اور بےمثل قطعہ لکھا ہے۔ اسلام اہلِ امّت سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم دعوے اسلام تو کرتے ہو مگر دردِ امّت نہیں رکھتے۔ اور جب تک یہ درد نہ ہوگا یہ سب سانگ ہے۔ نہ تمھاری نمازیں قبول ہوں گی نہ حج اور نہ روزے ؎

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دکھائے
دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دکھاؤ

دُنیا میں جراحت یہی عقبیٰ میں ہے راحت
کل پھل کوئی کھانا ہے تو زخم آج اُٹھاؤ

یہ قوم کے بچّے جو پڑے پھرتے ہیں بےکس
یہ پود ہے میری، اسے دیکھو نہ گنواؤ

شیریں ہے پھل ان پودوں کا اور سایہ ہے گھن کا
سیوا کرو ان کی، انھیں پروان چڑھاؤ

دیکھو نہ حقارت سے پھٹے کپڑوں کو اِن کے
اِن گدڑوں میں جو لعل کہ گم ہیں انھیں پاؤ

سنولائے ہوئے چہروں میں نور ان کے ہو تاباں اِن کوئلوں کو ہیرے جِلا دے کے بناؤ
ہیں اِن میں فقیہہ، ان میں حکیم، ان میں محدّث اِن کی بُری حالت پہ، بُری گت پہ نہ جاؤ
جو اِن میں ہیں جوہر کہیں زنگ اُن کو نہ کھا جائے گُن دیکھنے ہیں اُن کے تو زنگ اُن کا چھُٹاؤ
افواجِ مخالف ہیں تگ و دو میں چپ و راس رُند جائیں نہ یہ خاک میں جلد اُن کو اُٹھاؤ
پھرتے ہیں بہت گھات میں یہاں آ کے شکاری اِن پنچھیوں کو موت کے جنگل سے بچاؤ

آگے چل کر چند شعر ایسے دردناک کہے ہیں کہ پڑھ کر دِل لرز جاتا ہی۔

بیکس نہ گنو ان کو یہ کُنبا ہی خدا کا تم پھیر کے منھ اِن سے خدا کو نہ رُٹھاؤ
عبرت کی جگہ ہی ڈرو گردش سے فلک کی اولاد کو اپنی نظرِ بد سے بچاؤ
بن باپ کا بنتے ہوئے لگتی نہیں کچھ دیر غیرت کو بس اللہ کی حرکت میں نہ لاؤ

.. ..

ٹوٹے ہوئے دل ہیں یہ گزرگاہ خدا کی ملنا ہی خدا سے تو اِسی راہ سے جاؤ

ایک دو رباعیاں بھی ہم ناظرین کے لیے نقل کرتے ہیں :۔

رُباعی

پیری نہیں، منزلِ فنا ہی گویا اب کوچ کا وقت آ لگا ہی گویا
یوں جسم سے ہو گئی حرارت کافور اِک راکھ کا ڈھیر رہ گیا ہی گویا

دولت کی ہوس، اصلِ گدائی ہی یہ ساماں کی حرص، بے نوائی ہی یہ
حاجت کم ہی، تو ہی یہ شاہنشاہی اور کچھ نہیں حاجت، تو خدائی ہی یہ

اہلِ ہند کے متعلق لکھتے ہیں۔

نکبت میں ہی رنج و غم، خوشی سے اولیٰ رونا یاروں کا ہی ہنسی سے اولیٰ
ہیں دیس میں بے وقار، پردیس میں خوار مرنا ہی بس ایسی زندگی سے اولیٰ

کہاں تک کہیے، ان کے کلام میں حقیقت کے ساتھ کچھ ایسا سوز و گداز ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک غزل کے چند شعر لکھ کر اس تبصرے کو ختم کرتے ہیں ؎

نہ عیش کیخسروی رہے گا نہ صولتِ بہمنی رہے گی،
رہے گی اے منعمو! تو باقی دیے کی کچھ روشنی رہے گی
رہے گی گردش دکھا کے نیچا جو ہو گئے تارے تم آسماں کے
سدا کسی کی بنی رہی ہے نہ اب کسی کی بنی رہے گی
رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی
صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی، دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی
بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

جو لوگ مولانا حالی کے کلام کے قدرداں ہیں وہ اس مجموعے کی قدر کریں گے اور ہم شیخ محمد اسمٰعیل صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ جواہر پارے گم نامی سے بچا لیے۔

افاداتِ مہدی

اُردو اخبارات اُردو رسالوں کے پڑھنے والے "ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی" کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ ان کے نام کے ساتھ جو یہ دو لفظ لگے ہوئے تھے میں ان کا مطلب اس وقت تک نہ سمجھا جب تک میرے ایک دوست نے نہ سمجھایا۔ یہ کتاب انھیں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور ان کی بیوہ محترمہ نے چھاپ کر شایع کیا ہے۔ کل ستائیس مضمون ہیں جن میں دو ایک خط بھی ہیں۔ یہ مضامین وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً اخبارات اور رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں اب ایک جگہ جمع کرکے کتاب کی صورت میں شایع کیے گئے ہیں۔ مہدی بیگم صاحبہ کا یہ کام بہت قابل قدر اور لایق ستایش ہے۔ مرحوم کی اس سے بڑھ کر کوئی یادگار نہیں ہو سکتی۔ شروع میں ایک مختصر دیباچہ —— مولوی عبدالماجد صاحب بی۔اے کا ہے۔ اس کے بعد "اُن کی یاد" کے عنوان سے ان کی محترمہ بیوہ نے درد بھرے الفاظ میں مرحوم کی سرگزشت اور اُن کے عادات و خیالات اور معاشرت و ذوق کے حالات لکھے ہیں جو دو جزسے زاید ہیں۔ مضامین کے آخر میں مولوی عبدالماجد صاحب کا وہ مضمون بھی شریک کر دیا گیا ہے جو انھوں نے مرحوم کی وفات پر اخبار ہمدم میں لکھا تھا۔

ان مضامین کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا صاحبِ ذوق، علم دوست اور اپنی زبان کا عاشق ہے۔ اُردو کی جس قدر اچھی کتابیں چھپتی ہیں، اُسے شوق سے منگاتے ہیں اور بڑے چاؤ سے پڑھتے ہیں اور بہت اہتمام اور حفاظت سے اپنے کتب خانے میں رکھتے ہیں اور بعض اوقات اخباروں اور رسالوں میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اکثر اہلِ علم سے سلسلۂ خط و کتابت رکھتے ہیں۔ اور ان کی

دوستی اور صحبت کے گرویدہ ہیں ۔ مولانا شبلی مرحوم کے تو جان سے دلدادہ ہیں بلکہ مریدانہ عقیدت رکھتے ہیں ۔ چنانچہ اس مجموعے کے تقریباً ہر مضمون میں ان کا ذکر عقیدت مندانہ کرتے ہیں اور بعض مستقل مضامین تو شروع سے آخر تک مولانا کی مداحی میں ہیں ۔ وہ اُردو کے ہر اچھے انشا پرداز کی قدر کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں کی دل کھول کر داد دیتے ہیں ۔ یہ ادا اُن کی ایسی اچھی ہے کہ ان کی شرافت نفس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔ تاہم وہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیتے ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو " حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک "۔ اُن کی تحریر میں ایک قسم کی شیرینی اور بے تکلفی ہے اور اپنے مافی الضمیر کو عجیب بانکپن سے ادا کرتے ہیں ۔ اگرچہ وہ دور تک نہیں جاتے اور تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے مگر گرد و پیش کی چیزوں پر ایسی خوبی سے نظر ڈالتے ہیں کہ ان کی تحریر پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے ۔ ان کی تحریر میں اگرچہ ظرافت نہیں مگر شوخی اور چوچلاپن ضرور ہے ۔ انگریزی کے ادیب ہیں اور انگریزی ترکیبوں کو طرح طرح سے اُردو میں کھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات بڑی خوبی سے لکھ جاتے ہیں ۔ اُن کے تمام مضامین اُردو ادب سے متعلق ہیں ۔ اُردو کے ایسے دلدادہ بہت کم ہوں گے جگہ جگہ اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اُردو کا وجود آزاد، شبلی اور حالی کے دم تک ہی اس کے بعد اُردو ادب کا خاتمہ ہے ۔ وہ جدید تصانیف اور طرز تحریر سے بیزار ہیں ۔ اور اُردو کی ترقی کے لیے قسم قسم کی تجویزیں پیش کرتے ہیں ۔ یہ کمال شغف کی دلیل ہے ۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے اُردو زبان کی محبت ٹپکتی ہے اور اس سے اُن کے مضامین کی قدر ہمارے دل میں اور بڑھ جاتی ہے جو لوگ اُردو کے قدردان ہیں اور دلچسپ ادبی مضامین پڑھنے کے شائق ہیں ۔ وہ اس مجموعے کو پڑھ کر بہت خوش ہونگے اور مرحوم کی ادبی تنقید اور نکتہ سنجی کی داد دیں گے ۔

کتاب بہت اچھے چکنے کاغذ پر حکیم برہم صاحب اڈیٹر مشرق کے اہتمام سے خوب چھپی ہے ۔

انجامِ زندگی

یہ ایک ۴۶ صفحہ کا افسانہ ہے جو مسلسل تمدن دہلی میں شایع ہوتا رہا اور اب کتاب کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اس کی لکھنے والی "الم رقم" جنابہ ضیاً بانو صاحبہ ہیں۔ کتاب میں تین لڑکیوں کی ازدواجی زندگی بیان کی گئی ہے اور چونکہ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اسے تین افسانوں کا مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔

پہلی لڑکی صغیرہ ان بدقسمت ہستیوں میں سے ہے جو والدین کی مصلحتوں پر قربان کر دی جاتی ہیں۔ اس کا نکاح ایک ساٹھ سال کے مرد رحمت علی نامی سے ہوا ہے جو رشتے میں لڑکی کا چچا بھی ہوتا ہے۔

دوسری لڑکی بلقیس کی شادی ایک ہونہار گریجویٹ محمّد تقی کے ساتھ ہوئی ہے اس کی زندگی ویسی ہی ہے جیسی کہ اوسط درجے کے خوش حال گھرانوں کی ہوا کرتی ہے۔

تیسری لڑکی زمرّد اُن لڑکیوں کے نمونے کے طور پر لی گئی ہے جو اپنی بدسلیقی سے سے نہ صرف اپنے شوہروں کو ناراض کرتی ہیں بلکہ ان کی بدکاری کا سبب بھی بنتی ہیں۔

کتاب میں باوجود تلاش کے پلاٹ کی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ایک ہی کتاب میں تین قصّوں کا لکھنا اور وہ بھی اس طرح سے کہ پہلے باب میں پہلی لڑکی کا قصّہ، دوسرے میں دوسری کا اور تیسرے میں تیسری لڑکی کا علیٰ ہذا نہ صرف پڑھنے والوں کے لیے باعث زحمت ہے جنھیں باب تلاش کر کے تسلسل قایم رکھنا پڑتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے خود مصنفہ ربط کو قایم نہ رکھ سکی ہیں۔ صفحہ پر زمرد کی شادی "نثار حسین صاحب کے لڑکے" سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد ہر موقعے پر زمرد کے شوہر کا نام نثار حسین نظر آتا ہے بلکہ صفحہ ۴۴ پر تو بلقیس کے شوہر کا نام بھی محمد تقی کی بجائے نثار حسین ہی ہو گیا ہے۔ زمرد کے لڑکے حمید

کا ذکر کتاب میں اُس وقت آیا ہے جب کہ اُس کا شوہر اُسے طلاق دے چکا ہے۔ اس لڑکے کی عمر پانچ سال تبلائی گئی ہے، تینوں لڑکیوں کی شادیاں ایک ہی سال ہوئی ہیں۔ صغیرہ دو سال میں بیوہ ہوجاتی ہے۔ اس مدت میں زہرہ کے لڑکے کا چار پانچ سال کا ہوجانا اور بلقیس کی شادی کو "پانچ سال گزرنا" تعجبات سے ہے! صفحہ ۶ پر رحمت علی کی دو مرحوم بیویوں سے تین اولادیں دکھائی گئی ہیں، لیکن صفحہ ۱۷ پر صغیرہ کی چار سوتیلی اولادوں کا تذکرہ ہے،

یہ کتاب لڑکیوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور چاہیے تھا کہ اخلاق و تہذیب کا کوئی پہلو ہاتھ سے نہ دیا جاتا، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس تصنیف کا دامن متعدد اخلاقی دھبوں سے بھرا ہوا ہے اور ایسی عبارتیں درج کی گئیں جو اپنی انتہائے بداخلاقی کی وجہ سے خلاف قیاس نظر آتی ہیں۔ ہم چند مثالیں دیتے ہیں :-

(۱) رحمت علی کی "دو داشتہ عورتوں" کا تذکرہ نہایت آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اُس کی "رنڈی بازی" کا بھی ذکر کیا گیا ہے، ہمارے تعجب کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ یہ صاحب ۶۰ سال کے بزرگ اور دایم المرض ہیں۔ اسی طرح سے چاوڑی بازار کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور وہ بھی تلمیح طلب پیرایہ میں!

. . . .

(۲) صغیرہ کی سوتیلی لڑکی جو رشتہ میں اس کی چچا زاد بہن بھی ہوتی ہے اپنے باپ کی شادی کے متعلق یوں رائے زنی کرتی ہے۔

"آپا کو کوئی اور نہ جڑتا تھا تو چچا (رحمت علی!) پر کیوں نظر ڈالی، باپ ہی سے نہ کر لیا"!!

(۳) صغیرہ کا خسر جو اُس کے دادا کا بڑا بھائی بھی ہے اپنی بہو کی کسی تقریب میں جانے کے خلاف یوں گہرافشانی کرتا ہے :-

"دیدہ ہوائی ہوگیا ہے، دادا کی داڑھی پکڑ کر کہہ دیا ہوتا کہ میرا نکاح نہ کرو میرے

لیئے تو کوئی کو ٹھالے دو" واضح رہے کہ یہ اس معزز سوداگر کی گفتگو ہے جس کا ایک ۱۰
برس کا لڑکا ہنوز بقید حیات ہے، اور یہ گفتگو حقیقی چھوٹے بھائی کی پوتی کے ساتھ ہوئی ہے!

(۴) بلقیس کی ماں (جو ایک اوسط درجے کے سرکاری عہدہ دار کی بیوی ہے)
اپنی اُس بیاہی ہوئی بیٹی کو جو ہنوز چالوں کی دلہن ہے، یہ قیمتی نصیحت کرتی ہے:-

"بٹیا! یہ مرد کسی کے نہیں ہوتے۔ ان کے چاؤ چوچلوں پر اعتبار نہ کرنا ......
اگر میاں سے بے تکلف ہوگئیں تو ناکوں چنے چبوادے گا......... تمھارے ابّا،
اور سب لوگ کہتے ہیں کہ لڑکا بڑا پارسا ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کمائی کہاں جاتی ہے۔"

یہ پوری گفتگو، اور بالخصوص آخر کا معنی خیز کنایہ جس پر ہم نے خط کھینچ دیا؟، ایک ماں کے
منھ سے کس قدر اچھا معلوم ہوتا ہے۔

(۵) صغیرہ بیوہ ہو چکی ہے، اور میکے میں ہے، ایک دن اسے چپکے چپکے روتے دیکھ کر
حقیقی دادی یوں گویا ہوتی ہے:-

"لکھے کی پوری، کرموں کی پھوٹی! اچھے تقدیر کی ہوتی تو میاں کو کیوں کھا جاتی
..... خدا خیر کرے یہ ڈاین تو اس گھر کو کھائے بغیر نہ رہے گی۔"

یہ سب مثالیں ہندستانی اخلاق اور معاشرت کی کیسی شگفتہ تصویریں ہیں! جن
لوگوں نے "لڑکیوں کی انشا" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کا انصاف کریں گے کہ
"الم رقم" صاحبہ نے "مصور غم" صاحب کی تحریرات سے کہاں تک فیض حاصل
کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہی کتابوں کو دیکھ کر بجائے افسوس کے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا
ادب دوسری زبانوں میں منتقل نہیں ہوتا۔

کتاب میں خلاف فطرت واقعات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے تسکین و تشفی، راہ راست
پر لانا، بُرا انجام دکھانا، ان سب کا واحد ذریعہ خواب ہے۔ ہر الم موقعہ پر خواب میں

ایک "پیر مرد" نظر آتے ہیں، اور تلقین کرتے ہیں۔ ذیل میں کتاب کے صفحہ ۵۹ سے تھوڑی سی عبارت نقل کی جاتی ہی، ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس روشن خیالی کے زمانے میں اوہام پرستی کے سوا اور کوئی نام اسے دیا جا سکتا ہی یا نہیں:۔

"ایک دن کا ذکر ہی کہ سارا گھر بیٹھا ہوا ہی مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں باہر کے دروازے کی چٹخنی آپ ہی آپ کھُل گئی اور ایک کفن پوش شخص اندر داخل ہوُا۔ اس نے صغیرہ کے باپ، ماں، دادی، نانی سب کو خطاب کرکے کہا "صغیرہ مظلوم صغیرہ کا خون تمھاری گردن پر ہی........ یہ الفاظ کہ کر یہ کفن پوش رُخصت ہوگئی، یہ بات معمولی نہ تھی اس نے سب کو پریشان کر دیا۔"

کتاب کی زبان اور انشا کے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں، "مصوّرِ غم علامہ راشد الخیری کی تحریرات کی فیض یافتہ" خاتون سے اِن غلطیوں کا سرزد ہونا تعجب ہی۔ اس امر کا فیصلہ ہم ناظرین کی رائے پر چھوڑے دیتے ہیں کہ ان غلطیوں میں بیچارے کاتب کا کہاں تک حصّہ ہی:۔

"تمھاری ساس تمھارے شوہر کی ماں ہی۔ اُس کا اس گھر پر بڑا زور ہی۔"

"مانا کہ تمھارے ذمّے چاء کی تیاری نہیں پھر بھی تمھارے اس کام میں ہاتھ لگ جانے سے خاوند کی اسیری کے لیے ایک ضمانت ہی۔"

"سچّے پچ" "تومار" "دم دھانسا" "شغلہ لگا" "کنگھی رکھا ہؤا ہی" "میاں کھانے سے فراغت ہوئے" "کچکوے" (کچوکے) "جہیز بھی ملکیت قرار دی جا کر تقسیم ہو جائے" "روتے روتے آنکھیں سجھالیں" "عزیز و اقارب" "شور کی آواز"

"صور" وغیرہ وغیرہ۔

سب سے آخر میں ایک ضروری عرض کتاب کے نام کے متعلق بھی کرنا ہے۔
اس کتاب کا نام انجامِ زندگی ہے، جو اس میں شک نہیں کہ "صبح زندگی" "شام زندگی" "نوحہ زندگی" "شب زندگی" کے ساتھ نسبت معنوی رکھتا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن نفس کتاب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا بلکہ سمرنا کے چاند کی طرح "انجام زندگی" بھی کتاب کے آخر میں صرف مصنفہ کی اس دعا میں نظر آتا ہے: -

"خدا سب کو اور مجھے نیک اور کامیاب زندگی بسر کرنے کی توفیق دے اور زندگی کا انجام اچھا ہو۔"

کیا اچھا ہو اگر ہماری تعلیم یافتہ خواتین اپنے صحیح ادبی ذوق کو بے جا تقلید کی نذر نہ کردیں بلکہ تقلید و تتبع میں بھی امتیاز و تنقید کا پہلو ہاتھ سے نہ دیں۔ ملک میں زنانہ انشا پردازی کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں، محترمہ محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ، بیگم صفدر علی صاحبہ، بنت نذرالباقر صاحبہ ان سب معزز خواتین کے افسانے موجود ہیں۔ کیوں نہ اُن سے فایدہ اُٹھایا جائے اور انھیں اپنی ابتدائی کوششوں کا نصب العین بنایا جائے۔

دیوان جان صاحب

نظامی پریس بدایوں کے ہاں سے خواجہ میر دردؔ کے کلام کے ساتھ جان صاحب کا دیوان
بھی شایع ہوا ہی۔ سچ ہی جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ ڈر ہی کہ نظامی
صاحب نے جو نیک نامی اور شہرت اُردو ادب کی خدمت سے حاصل کی ہی وہ کہیں
اس قسم کے کلام کی اشاعت سے زایل نہ ہو جائے البتہ اس کی داد دینی پڑتی ہی کہ
نظامی صاحب نے اس دیوان کے مقدمے کے لیے ایسے موزوں اور مناسب صاحب
کو تجویز کیا ہی کہ اُن سے بہتر شاید ہندستان بھر میں کوئی دوسرا نہ ملتا۔ آغا حیدر حسن صاحب
دہلوی کو دلی کی بیگماتی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہی۔ وہ عورتوں کے خیالات
کو ٹھیٹ انھیں کی زبان میں اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ خود عورتیں بھی دنگ رہ جاتی
ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لب و لہجے اور وضع و ترکیب میں ایسی ملایمی اور نزاکت
پائی جاتی ہی کہ بہت سی عورتوں کو بھی نصیب نہیں اگر کوئی انھیں پردے کے پیچھے
باتیں کرتے سنے تو سمجھے کہ دلی کی کوئی نازنیں اپنی سہیلیوں میں بیٹھی باتیں کر رہی ہی۔
میر علی جان صاحب نے اگر زنانہ بول چال کی نظم میں نام پایا تو آغا حیدر حسن صاحب
اس کے مقابلے میں نثر کے جان صاحب ہیں۔ حق یہ ہی کہ میر صاحب کی قدر کچھ آغا
صاحب ہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ مقدمہ خوب دل کھول کر لکھا ہی پورے چوراسی صفحے رنگے
ہیں اور اس میں رطب دیا بس سب ہی کچھ آگیا ہی۔

جان صاحب کی شاعری جیسی کچھ ہی معلوم ہی اس پر آغا "جان صاحب" جو کچھ چاہتے
لکھتے۔ لیکن قیامت یہ کی ہی کہ اُسے اُس کے کلام سے بہت بڑا محب وطن، قوم پرست
اور تارک موالات ثابت کیا ہی اور وہ بھی ایسے اشعار سے کہ اُن کا پڑھنا اور سُننا تو

درکنار کاغذ پر لکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں ڈاکٹر سید محمود صاحب کا وہ مقدمہ یاد آگیا جو انھوں نے نظامی صاحب ہی کی فرمایش سے اُن کے مطبوعہ دیوان غالب پر تحریر فرمایا ہے۔ اس میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بڑی جدت کی ہے اور مرزا غالب کو بہت بڑا قوم پرست (نیشنلسٹ) اور محب وطن ثابت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مرزا صاحب کا بہت سا کلام جو اُن کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے خارج کر دیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ باغیانہ کلام تھا۔ یہ خیال پہلے پہل ہم نے ڈاکٹر سر اقبال سے سُنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سیّد محمود وہیں سے لے اُڑے۔ ایسی بھونڈی باتیں لکھنا گویا شاعر کا مضحکہ اُڑانا ہے۔ آغا جان صاحب نے اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کی ہے کہ جان صاحب کے گندے اور ناپاک شعروں سے یہی استدلال کیا ہے۔ کہاں بیچارہ جان صاحب اور کہاں قوم پرستی اور حبِّ وطن۔

ایک دوسرا ستم یہ ڈھایا ہے کہ جان صاحب کے کلام کا مقابلہ سیفو کی شاعری سے کیا ہے۔ جان صاحب کے مقابلے میں سیفو کا نام لینا ادبی کفر ہے۔ کہاں ایک عاشقِ صادق اور کہاں ایک بیسوا، کہاں وہ پاک جذبہ اور کہاں یہ جھوٹی نقالی۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ان دو شاعروں کے کلام میں کون سی شے مشترک تھی۔ ایک قدیم زمانے کی نامور عورت شاعر ہے اور ایک اس زمانے کا مرد شاعر ہے جو عورتوں کی بولی میں شعر لکھتا ہے۔ ان کا آپس میں کیا مقابلہ؟ رہی ان دونوں کی شاعری سو اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سیفو کے متعلق ایک قدیم صاحب نظر مصنف کا قول ہے کہ "یہ عجیب و غریب ہستی ہے۔ تم تاریخ میں ہزار ڈھونڈو ایک عورت بھی ایسی نہ پاؤ گے جو کسی پہلو سے بھی اُس کے مقابلے میں آسکتی ہو"۔ ایک دوسرا نقاد لکھتا ہے "اس کے کلام میں آگ بھری ہوئی ہے"۔ اس کا مقابلہ جان صاحب سے کیا جاتا ہے۔ یہ ذوقِ سلیم کا خون کرنا ہی نہیں بلکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنی ہے۔

ایک کام بہت اچھا کیا ہی کہ آخر میں مشکل اور غریب الفاظ اور محاورات کی فرہنگ بھی لگا دی ہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ آغا صاحب نے جان صاحب کے کلام کو بہت غور سے پڑھا ہی اور مقدمہ لکھنے میں بہت محنت کی ہی۔

ایک بات اور نئی اس کتاب میں دیکھنے میں آئی کہ آغا صاحب نے کتاب سے الگ، صرف اپنا مقدمہ ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کے نام پر معنون کیا ہی۔ خدا کرے مقبول ہو۔

ناٹک ساگر

[یعنے دنیاے ڈراما کی تاریخ]

میاں نور الٰہی اور صاحبزادہ محمد عمر صاحبان سے اُردو کے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔ ڈراما پر اُن کے بعض مضامین اس رسالے میں شایع ہو چکے ہیں جو اِسی کتاب کے اجزا تھے۔ نیز اِن کے بعض ڈراموں پر (جن میں سے اکثر ترجمے تھے) تبصرے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ اِن دونوں صاحبوں نے اس بات کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ دنیا کے بہترین ڈراموں کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں گے۔ ڈرامے ہی تالیف کریں گے مضامین بھی ڈرامے ہی پر لکھیں گے اور غالباً باتیں بھی ڈرامے ہی کی کرتے ہوں گے۔ غرض ان کا اوڑھنا بچھونا ڈراما ہے۔ بعض لوگوں کے خاص خاص لفظ تکیۂ کلام ہوتے ہیں گویا وہ ٹھیکے ہیں۔ جن کی مدد بغیر وہ کوئی جملہ نہیں بول سکتے، اسی طرح ڈراما اِن دونوں صاحبوں کا "تکیۂ خیال" ہے۔ کوئی مضمون ہو کوئی خیال ہو وہ یا تو ڈرامے کے متعلق ہوگا یا اُس سے ٹکرا کر نکلے گا۔ یہ اسی انہماک کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے دُنیا بھر کے ڈراموں کی تاریخ لکھ ڈالی ہے جس میں ہر ملک کے مشہور ڈراما نگاروں اور ایکٹروں کے خاص خاص کارنامے، ممالکِ عالم کے اسٹیج کے عروج و زوال کے اسباب اور فن ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کی ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس فن پر ایسی جامع حیثیت سے لکھی گئی ہے۔ کتاب کیا ہے درحقیقت ایک ساگر ہے جو دلچسپ اور مفید معلومات سے بھرپور ہے۔

ہندستان کا باب ایک سو بارہ صفحے پر ہے جس میں اس ملک کے قدیم اور جدید

ڈرامے پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس میں اُردو ڈرامے کے حصے میں تقریباً اڑتیس صفحے آئے ہیں بہت ہی پُرلطف مضمون ہے اس میں اُردو تھیٹروں اور ناٹکوں کی پوری تاریخ اور اُن کی تنقید۔ ڈراموں کے مصنفوں کا ذکر۔ ان کی خصوصیات مشہور اور ہردل عزیز ایکٹروں کے حالات۔ اُن کا اثر۔ لوگوں کا شوق۔ فن اور متعلقات فن کے متعلق تنقیدی اور ادبی نکات۔ یہ سب باتیں ایسی خوبی سے لکھی ہیں کہ لائق مصنفین کی تحقیق اور کاوشش کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کبھی اس تفصیل او جامعیت کے ساتھ کسی نے اس مضمون پر بحث نہیں کی تھی۔ لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اُردو زبان میں کوئی اعلیٰ درجے کا ڈراما نہیں لکھا گیا۔ البتہ بنگالی زبان کو یہ عزت حاصل ہے۔ وہاں ہماری طرح اِس فن کو معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ ابھی ہمیں کچھ دنوں انتظار کرنا پڑے گا کہ اُردو میں ایسا ڈراما لکھا جائے کہ ہر لحاظ سے اعلیٰ پایہ کا ہو . . . . اور اس کا ترجمہ غیر زبانوں میں کیا جائے

اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس فن کو حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کی حالت بعینہ وہی ہے جو اِس زمانے میں موسیقی کی ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ اگر اس سے سلیقہ سے کام لیا جائے تو بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں اور اصلاح حالت اور اصلاح ذوق میں بہت بڑی مدد دے سکتا ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری ہمارے ادیبوں اور صاحب ذوق حضرات پر ہے۔ کئی سال کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں ایک تھیٹر آیا ہوا تھا۔ ہمارے ایک دوست نے اُسی زمانے میں ایک ڈراما لکھا تھا وہ انھوں نے تھیٹر کے مالک کو سُنایا بعض مقامات سن کر اُسے بہت رقّت ہوئی سب سننے کے بعد اس نے ڈرامے کی بہت تعریف کی اور مصنف کی خوب داد دی۔ مگر ڈرامے کے لینے سے معذوری ظاہر کی۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ ہم اسٹیج کے لیے ایسے ڈرامے لیتے ہیں جنھیں سُن کر چوتھے درجے کے بیٹھنے والے تحسین و آفرین کے

نعروں سے داد دیں۔

جب ڈرامے کا معیار یہ ٹھیرا تو ظاہر ہو کہ اس کی حالت کیا ہو گی۔ اس کتاب کے شروع میں حضرت کیفی (جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب دہلوی) نے ایک عالمانہ اور محققانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہو جس میں انھوں نے بڑی سچّی بات لکھی ہو" یہاں میں ایک سوال کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تھیٹر میں ایک کھیل ہو رہا ہو اور اسٹیج پر ایسی تقریر کرائی جاتی ہو یا ایک ایسا سین دکھایا جاتا ہو جسے مذاق سلیم گوارا نہیں کر سکتا۔ اِس پر اگر دس بیس بھلے آدمی حاضرین میں سے اظہار ناپسندیدگی کریں یا تماشے سے اُٹھ جائیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تماشا کرنے والی کمپنی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اس کی نظیریں موجود ہیں"۔ ہماری اخلاقی بُزدلی نے ایک ڈرامے ہی کو کیا ہمارے بہت سے معاملات کو خراب کر رکھا ہو۔ اصلاح و ترقی کے لیے اخلاقی جرأت سب سے زیادہ ضروری چیز ہو۔

ہمیں یقین ہو کہ اِس کتاب کی اشاعت ڈرامے کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرے گی۔ بہت سے ایسے نکتے معلوم ہوں گے جن سے ہم بے خبر تھے اور ملک کے انشا پردازوں کے لیے ہدایت کا کام دے گی۔ جو صاحب ڈرامے سے شوق رکھتے ہیں یا جن کا رجحان اِس طرف ہو اُن کے لیے یہ کتاب ایک نعمت ہو۔ نورِ عمر صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اُردو ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ہو۔ اور ایک ایسے مضمون پر کتاب لکھی ہو جس سے ہماری زبان خالی تھی۔

ناظرین کو حیرت ہوگی کہ یہ پونے پانسو صفحے کی کتاب ایک ہفتے میں چھپ کر تیار ہوئی ہو یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہو۔ یہ تو خیر چھپائی کا کام ہو ہم نے سُنا ہو کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ عجلت کے آثار اس کتاب میں بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مگر وہ مصنفین کی محنت۔ وسعتِ نظر اور مضمون کی اہمیت کے مقابلے میں اس قدر ضعیف ہیں کہ قابلِ ذکر نہیں۔

ہند عہدِ اورنگ زیب میں

یہ کتاب جناب مرزا یار جنگ بہادر (مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب) نے تحریر فرمائی ہے جس میں دس باب ہیں۔ پہلے نو باب درحقیقت تمہیدی ہیں، اصل باب جس سے کتاب کی غرض وغایت متعلق ہے دسواں ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے لیے مسئلۂ اتحاد پر ہر پہلو سے غور کیا گیا ہے کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات سے خوشی ہوئی کہ مرزا صاحب نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے بحث کی ہے نہ کسی پر حملہ کیا ہے نہ کسی کو الزام دیا ہے بلکہ بہت نرمی اور شائستگی سے ہر پہلو پر غور کیا ہے ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ ان کی نیک نیتی اور صفائی دل کی شہادت دیتا ہے۔ آخر میں اُنھوں نے خلوص کے ساتھ یہ درخواست کی ہے کہ دوسرے اصحاب بھی اس مسئلے پر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار فرمائیں تاکہ آئے دن جو جھگڑے ٹنٹے ہمارے ملک بپا ہوتے رہتے ہیں ان کی جڑ کٹ جائے اور اہل وطن صلح و آشتی کے ساتھ رہنے سہنے لگیں۔

اِس کتاب کی تحریر کا باعث مسٹر جے آر رائے صاحب کا مضمون ہوا جو زمانے میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مسٹر رائے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے خطوط کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عہد مغلیہ میں رشوت کا بازار گرم تھا۔ رعایا تنگ دست اور مفلوک الحال تھی۔ تجارت پر تباہ کن قیود عاید تھیں۔ صداقت نابود تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنی دشوار تھی۔ ملک میں رہزنوں کا ڈر تھا۔ زمین کا بڑا حصہ ویران اور غیر آباد تھا۔ تعلیم کا نام و نشان نہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ چند باب لکھے ہیں۔ فاضل مؤلف کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ "یہ مضمون تاریخ کی وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہدِ

اورنگ زیب کے واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے" اور یہ بالکل صحیح ہے۔ انھوں نے مسٹر رائے کے الزامات کے جواب میں صرف اورنگ زیب کے عہد کو لیا ہے جو سب سے زیادہ اعتراضات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور اپنی تائید کے لیے انھوں نے نہ تو مسلمانوں کی تاریخوں کا حوالہ دیا ہے نہ ہندوؤں کی تاریخوں سے مدد لی ہے اور نہ انگریزی تاریخوں پر نظر ڈالی ہے۔ بلکہ ان سب سے قطع نظر کر کے انھوں نے ایک ایسے شخص کے بیانات پیش کیے ہیں جس نے اس عہد کے واقعات اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ جو اگرچہ ایسٹ انڈیا کا ملازم تھا مگر اس نے اپنی تحریر میں انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا ایسے شخص کی شہادت اُن تاریخوں اور مضامین کے مقابلے میں بہت زیادہ قابلِ وقعت ہے جن کی بنیاد زیادہ تر قیاس اور جانبدار روایتوں پر ہے۔

اس شخص کا نام الگزنڈر ہملٹن تھا۔ یہ ایک انگریز سیاح اور سوداگر تھا۔ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا ۱۶۸۸ء میں جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا بہت سا سوداگری مال لے کر چند توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ساتھ اپنے ملک سے چلا اور تمام ساحل افریقہ و عرب و ایران میں تجارت کرتا ہوا ہندستان پہنچا۔ تخمیناً ۲۵ برس تک ہندستان اور اس کے گرد و نواح میں زندگی بسر کی اور اپنا سفر نامہ لکھا۔ اسی سفر نامہ سے فاضل مؤلف نے عہدِ اورنگ زیب کے بہت سے حالات اور واقعات پیش کیے ہیں جنھیں پڑھ کر بہت سی غلط فہمیاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

ہم ذیل میں اُس کے چشم دید حالات کے بعض اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا بجنسہ بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے لکھ دیا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے وہ سندھ کے ایک شہر ٹھٹہ میں پہنچا۔ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے:-

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ، فلسفہ و سیاسیات کے لیے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کی تعلیم دینے کے لیے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں۔"

مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے اگلے زمانے میں مناتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں کہ شوہروں کے مُردوں کے ساتھ ستی ہوں"۔

جب سورت میں پہنچتا ہے تو مذہبی حالت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی سخت جھگڑے اُن کے اعتقادات اور طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا اِن لوگوں میں مفقود ہے"۔

اِس نے ملک کی خوش حالی۔ ارزانی اور ثروت کے جو حالات لکھے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے کہ ایک ٹن نمک ایک کراؤن (دو ڈھائی رُپے) میں آتا ہے۔ کٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ۔ ڈھاکہ میں دو آنے میں سو مچھلیاں آتی تھیں جو اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی دو مچھلیاں آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتی تھیں اور ایک رُپے میں پانسو اسّی پونڈ چاول ملتے تھے"۔

اِسی طرح اس نے ملک کے امن و امان، تجارت۔ حرفت و صنعت۔ مہمان نوازی۔ یہاں کے باشندوں کے اخلاق۔ یورپین تجار سے اورنگ زیب کے برتاؤ کے متعلق بیسیوں واقعات لکھے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "سیاہ فام ہندستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں جتنی کہ گورے چمڑے والوں میں ہے"۔ ملک کے امن وامان کی بہت تعریف کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ "یہاں ڈاکہ اور قتل کی خبریں

بہت کم سُنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں چلا جائے تو کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہو اور کیوں جاتا ہو۔" وہ یورپین تجار سے اورنگ زیب کے منصفانہ برتاؤ کی تعریف کرتا ہو اور یورپین تجار کی پالیسی اور اخلاق کو شرمناک بتاتا ہو اور اس کی تائید میں اُس نے متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر فاضل مؤلف اسی کے ساتھ ایک دوسرے یورپی سیاح کے بیانات بھی اپنی کتاب میں درج کر دیتے جو نہ کسی کا ملازم تھا نہ تاجر تھا بلکہ اپنے گھر سے دُنیا کی سیاحت کی خاطر نکلا تھا اور جس نے اورنگ زیب سے خلوت اور عام دربار میں ملاقات کی عزت حاصل کی تھی۔ یہ شخص اٹلی کا رہنے والا اور سول لا کا ڈاکٹر تھا۔ دُنیا کی سیر کرتا ہوا یہ ۱۳ رجون ۱۶۹۵ء میں ہندستان پہنچا اور دسمبر ۱۶۹۹ء تک یہاں رہا۔ وہ ۵ رمارچ ۱۶۹۵ء کو گوا سے اورنگ زیب کے اُردوئے معلیٰ کی طرف روانہ ہوا جو اُس وقت گلگلا میں تھا (غالباً یہ مقام بیجاپور کے قرب وجوار میں معلوم ہوتا ہی)۔ رستے میں جہاں کہیں اُسے موقع ملتا چوری چھپے بتوں کو توڑ جاتا تھا۔ آخر ۱۷ رمارچ کو منزل مقصود پہنچا۔ ۲۱ رمارچ کو بادشاہ سے خلوت میں ملاقات ہوئی اور اس کے بعد دربار عام میں بھی حاضر رہا۔ یہ حالات اس نے بڑے لطف سے لکھے ہیں۔ بادشاہ نے اس سے مختلف قسم کے سوال کیے، اور ہنگری اور ترکی کی لڑائی کا حال پوچھا اور دول یورپ کے حالات دریافت کرتے رہے۔ یہ سیاح (جمیلی کریری) اورنگ زیب کی مذہبی رواداری کی بہت تعریف کرتا ہو۔ وہ کہتا ہو کہ اورنگ زیب کی فوج کے عیسائی افسروں نے میری بڑی خاطر مدارات کی۔ اور انھوں نے کہا کہ اس بادشاہ کی ملازمت ایک طرح کی مسرت اور خوشی ہو۔ کیونکہ اوّل تو کوئی بادشاہ اپنے سپاہیوں کو اتنی تنخواہ نہیں دیتا اور جب وہ کبھی لڑنا نہیں چاہتے یا ٹھیک طور سے بہرہ نہیں دیتے تو صرف یہی سزا دی جاتی ہو

کہ اُس روز کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے۔جس روز ایسا واقع ہوتا ہے۔ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی۔فوج میں رومن کیتھلک والوں کا ایک گرجا تھا جس میں دو پادری مذہبی خدمات انجام دیتے تھے۔اس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک عیسائی کپتان نے دو مسلمانوں کو شراب نوشی کی سزا میں بندھوا کر پٹوایا اور ان دونوں نے کپتان کا اس مناسب سزا پر شکریہ ادا کیا۔ وغیرہ وغیرہ........

بہر حال ان چشم دید بیانات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں پوری مذہبی رواداری تھی اور وہ اس قدر متعصب نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔

اب ہم دسویں باب پر آتے ہیں جو کتاب کی جان ہے اور جس کی خاطر یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔اس باب کے لائق مؤلف نے تین حصے کیے ہیں۔ پہلے حصے میں انھوں نے گزشتہ ابواب کا خلاصہ بیان کرکے یہ بتلایا ہے کہ عہد مغلیہ بھی اہل ہند کے لیے اسی طرح قابلِ فخر ہونا چاہیے جیسا کہ اشوک یا چندر گپت کا زمانہ اور ہندوؤں کا یہی نقطۂ نظر ہونا چاہیے دوسرے حصے میں اِس امر پر بحث کی ہے کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہیے۔اول خلافت پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سیاسی خلافت محال ہے۔تمام عالم کے مسلمانوں کا نہ پہلے کبھی کوئی سیاسی خلیفہ تھا اور نہ اب ممکن ہے اور اگر سیاست خلافت سے نکال لی جائے تو پھر خلافت کوئی چیز نہیں رہتی۔غرض مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر فاضل مؤلف کی رائے میں یہ ہونا چاہیے کہ "وہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنے تمام برادرانِ وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا تصوّر کریں اور وہ کشتی ہندستان ہے" گویا ہندستان کی ذلت اور تباہی ان کی ذلت اور تباہی اور ہندستان کا عروج اُن کا عروج ہو۔تیسرے حصے میں نفاق کے نتایج اور باہمی اتحاد کی تدبیر پر بحث کی ہے۔اتحاد کی تدابیر مفصلۂ ذیل بتائی ہیں۔
اصلی تدبیر اُن کی رائے میں یہ ہے کہ ہندستان کی صحیح تاریخ ہندستانی نقطۂ نظر

سے لکھی جائے جس میں نہ تعصب کو دخل ہو اور نہ غلط فہمی کا امکان اور ایسی ہی تاریخیں
مدارس کے نصاب میں داخل کی جائیں۔ اُن کا خیال ہے کہ باہمی اتحاد کو سب سے بڑا
صدمہ ایسی تاریخوں سے پہنچا ہے جن میں حقیقت اور صداقت کو چھپا کر تعصب کا تخم بویا
گیا ہے۔ اس اصل تدبیر کے بعد چند اور چھوٹی چھوٹی تدبیریں بھی بتائی گئی ہیں۔ مثلاً اضلاع
کی کانگریس کمیٹیاں مقامی ضروریات اور حالات کے رو سے اتحادی تجاویز عمل میں
لائیں۔ اخباروں میں اتحادی مضامین کی بھرمار کی جائے۔ دہلی کی اتحادی کانفرنس کی
تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کانگریس کی رکنیت کے لیے یہ شرط لازم قرار
دی جائے کہ ہر رکن اتحاد پر ایک مضمون لکھ کر کسی اخبار میں شایع کرے یا کانگریس
کمیٹی میں پیش کرے۔ قابل مؤلف کا مقصد اس سے یہ ہے کہ قبل اس کے کہ کوئی شخص
انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی درخواست پیش کرے وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلے
پر غور کر کے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر لے۔ ہندو مسلمانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ
مدارس کا اصول درست نہیں۔ ان کے بچوں کو ایک جگہ تعلیم دی جائے تاکہ بچپن سے
باہم محبت اور دوستی کے خیالات پیدا ہو جائیں۔ جیسا کہ پہلے دستور تھا اب بھی کوشش
کی جائے کہ ہندو مسلمان آپس میں ملیں جلیں ایک جگہ اٹھیں بیٹھیں۔ غرض جہاں تک
ممکن ہو ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے موقعے پیدا کیے جائیں۔ مؤلف کی رائے
میں اتحاد قایم رکھنے کے لیے مسلمانوں کے جداگانہ حق میں ہاتھ نہ لگانا چاہیے یہ جھگڑوں
کا چھتہ ہے اور جو قرار داد لکھنؤ میں ہو چکی ہے اس پر قایم رہنا چاہیے۔ ان کے خیال
میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب سے وہی فایدہ ہو گا جو انگلستان کی پارلیمنٹ کو مختلف
فریقوں کے وجود سے ہوتا ہے یعنی متضاد قوتوں اور کششوں میں اعتدال پیدا کرنا۔
آخر میں فاضل مؤلف نے اپنا ذاتی عقیدہ یہ بیان کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو کر
رہے گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

یہ تجویزیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں بہت اچھی ہیں اور جناب مرزا صاحب کے خلوص پر دلالت کرتی ہیں لیکن کیا اس پیچ در پیچ مسئلے کے حل کرنے کے لیے جس نے اس وقت ایک عجیب ناگوار صورت اختیار کر لی ہو کافی ہیں؟ اصل اور بڑی تجویز یہ بتائی گئی ہو کہ ہندستان کی تاریخیں سچائی اور صداقت کے ساتھ لکھی جائیں۔ یہ بہت عمدہ تجویز ہو لیکن اتنی مدت کے بعد جب کہ زہر سرایت کر چکا ہو۔ اب اس ذریعے سے اتحاد اور اتفاق قایم کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے ایک زمانہ چاہیئے۔ قطع نظر اس کے ان تجویزوں کے عمل میں لانے کے لیے کوئی صورت نہیں بتائی گئی۔

ہم اکثر اگلے زمانے کی محبت والفت کا ذکر حسرت سے کرتے ہیں (اور حقیقت یہ ہو کہ موجودہ حالت دیکھ کر دل کو ٹھیس لگتی ہو) اور حیرت کرتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا اور دل سے یہ آرزو کرتے ہیں کہ پھر وہی لیل ونہار ہوں۔ وہی محبت و آشتی ہو۔ وہی دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات اور باہمی موانست ہو۔ ہمارے اخباروں اور تقریروں میں یہ خیالات اور یہ تمنائیں بار بار دُہرائی جاتی ہیں۔ بے شک یہ باتیں نیک نیتی پر محمول ہو سکتی ہیں مگر حقیقت سے بعید ہیں۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا ہو۔ نہ وہ اگلا سا نظام حکومت ہو نہ وہ آئین و قوانین ہیں۔ نہ وہ معاشرت ہو۔ نہ وہ خیالات ہیں۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہو کہ وہی حالات پیدا ہو جائیں جو پہلے تھے۔ اس وقت ہم پر ایک جدید حکومت فرماں روا ہو جس کے تحت ہم نے حقوق طلبی کا نیا سبق سیکھا ہو۔ تعلیم کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ہو۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب نمایاں ہو۔ جو پہلے رعایا اور حاکم تھے اب خواجہ تاش ہیں۔ اس لیے نہ وہ تعلقات قایم رہ سکتے ہیں اور نہ وہ معاشرت باقی رہ سکتی ہو۔ لیکن اتحاد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہو کیونکہ مقابلہ ایسے سے ہو جو ہم سے کہیں افضل ہو۔

ہندو مسلمانوں میں جو جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں اُن میں سے اکثر

بلکہ سب کے سب مذہبی سمجھے گئے ہیں۔ ہندستان عام طور پر ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے مذہب و تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر باتیں جو مذہب کے نام سے مشہور رہیں محض تعصبات اور توہمات ہیں۔ جس ملک کے اتحاد کا انحصار معبدوں کے سامنے باجے بجانے۔ پیپل کی ٹہنیوں کے کاٹنے اور گائے کے ذبح پر ہو وہاں اتحاد ہونا معلوم۔ تعجب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے سردار اور رہنما اتحادی کانفرنسوں اور انجمنوں میں اُنھیں توہمات اور تعصبات پر جوش و خروش سے بحثیں کرتے اور انھیں قواعد کے تحت میں لانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو کسی قاعدے کی پابند نہیں ہوسکتیں۔ توہمات اور تعصبات کی اصلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ان کا استیصال ہے۔ اگر ہمارے رہنما بھی ان توہمات پر ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں جیسا کہ عوام تو اُن پر افسوس ہے اور اگر وہ ان باتوں کو مہمل سمجھتے ہیں اور پھر ان کی حمایت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ افسوس ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے جب اپنا کام شروع کیا تو سب سے پہلے انھوں نے توہمات اور تعصبات کی جڑ کاٹنی شروع کی اور مخالفت اور بدنامی کی کچھ پروا نہ کی اور یہی صحیح طریقہ اصلاح کا ہے۔ شاید ہمارے رہنما ڈرتے ہیں کہ اگر ان باتوں کی مخالفت کی گئی تو ان کی ہر دل عزیزی اور شہرت میں فرق آجائے گا لیکن ایسی شہرت اور ہر دل عزیزی جو اس قسم کے توہمات پر مبنی ہے قایم رہنے والی نہیں۔ رسوائی کہیں نہ کہیں اُس کی تاک میں لگی ہوئی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اتحاد کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ان تعصبات اور توہمات سے بالا ہو جس کا تعلق نہ کسی خاص مذہبی انجمن سے ہو نہ کسی سیاسی کانفرنس سے۔ وہ آزادانہ کام کرے اور اہل ملک کی آنکھیں کھولے کہ وہ کن مہملات میں مبتلا ہیں اور اپنی ان حرکات سے ملک کو کیا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

وہ ایک معتد بہ سرمایہ جمع کر کے اعلیٰ درجہ کا اخبار اور رسالہ جاری کرے اور رفتہ رفتہ ہر صوبے کی مقامی زبان میں اسی قسم کے اخبار اور رسالے شایع کیے جائیں وہ ان تمام تعصبات اور توہمات کو نہایت تحمل اور شایستگی سے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ ہندستان کی تاریخ کے متعلق صحیح اصول پر تحقیق کا کام کرے اور ملک میں رواداری اور بلند نظری کے خیالات پھیلائے۔ اگر چند عالی خیال اصحاب اخلاق جرأت سے کام لے کر کھڑے ہو جائیں تو سیکڑوں آدمی اُن کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور جب لوگوں کو اُن کی راستی اور خلوص پر یقین ہو جائے گا تو اُن کے قول پر بہ نسبت کسی دوسری جماعت کے زیادہ اعتماد ہوگا۔ وہ ملک میں ایک زبردست قوت ہو جائے گی اور ان تمام تجویزوں کو زیادہ خوبی سے انجام دے گی جس کی تمنّا فاضل مؤلف نے اپنی کتاب میں ظاہر کی ہے۔ ورنہ اگر فساد کی اصل بنا قایم رہی اور دونوں جانب سے یہی مطالبات پیش ہوتے رہے تو مصالحت کی جتنی کوششیں کی جائیں گی وہ سب بیکار ہوں گی۔ اگر فاضل مؤلف اس بات پر آمادہ ہوں تو اس جماعت کے پروگرام پر تفصیلی بحث بعد میں ہو سکتی ہے ——

———
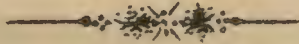
مکتوباتِ حالی

(مرتبہ جناب خواجہ سجاد حسین صاحب بی۔ اے)

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کے حیرت انگیز جد و جہد۔ قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم وکلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ اُن کے پاس سے جو اُٹھا کچھ لے کر اُٹھا اور اُن کے پاس جو گیا کچھ بن کر آیا۔ مولانا حالی ان پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور اُن سے محبت بھی۔ اُن کے کلام نے اُردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اُردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کی متین اور چچی تُلی نثر اور تنقید نے اُردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے دل میں اُن کا ادب و احترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف ان کی سیرت ہے۔ ان کے پاکیزہ اخلاق اور اطوار۔ اُن کی دل سوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود اُن کی طرف کھچ جاتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی مذمت یا بُرائی سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے

روکتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان پر سخت اور بیجا تنقیدیں کیں۔ اُن کو بھی انھوں نے سراہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اُس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ خطوں کے اس مجموعے میں جو اب چھپ کر شایع ہوا ہے زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روزمرّہ کی معمولی باتیں۔ آئے دن کے آلام و افکار۔ اپنی اور دوسروں کی بیماری اور مصیبت کا ذکر ہے۔ مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں ان کے دلی خیالات اور اُن محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

ان میں سے اکثر خط اُس وقت کے ہیں جب وہ سرسید مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔ اِس قابلِ قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں انھوں نے بے حد محنت اور جانفشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری، خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے اُن کی زندگی تلخ کر دی تھی وہ برابر اس سے لپٹے رہے اور کئی سال تک خونِ جگر کھانے کے بعد اسے تمام کیا۔ جو کتاب اس قدر دماغ سوزی۔ زحمت اور مسلسل کوشش اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئی تھی جب وہ شایع ہوئی اور ان لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے۔ اور [illegible] سید مرحوم کے فدائی ساتھی اور ہمدرد تھے تو معلوم ہوتا ہے

کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔ چنانچہ وہ ایک صاحب کو جو نواح علی گڑھ کے رئیس اور روشن خیال صاحب ذوق اور صاحب علم ہیں۔ یہ لکھتے ہیں کہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہوچکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیپوٹی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوائی ہوں گی کیونکہ اگر مصنف قابلِ وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اُس کی بائیوگریفی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہی مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہی جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا اب تک کچھ نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہوگئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی شخص خوش ہوسکتا ہی جو تجارت کے سوا تصنیف وتالیف کا اور کوئی مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔ اور اخباروں کو جانے دیجیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہی اور جس کا اہتمام محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری اور سرسید کے جانشین اور ان کے زبدۂ احباب کے ہاتھ میں ہی آج تک حیات جاوید کی نسبت اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بار گراں کو اپنے ذمّے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور خواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہی اور اسلیے اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اسکی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے مگر آجتک کسی نے

اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیتہً پیش کی جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ..صاحب نے سرسید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانسو رُپے کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا مگر میں سرسید کو اور اپنے تئیں بڑا خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ انھوں نے کوئی کاپی ڈیوٹی سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعہ کے لائق سمجھا ہے آپ یقین جانئے کہ میں اس زمانے کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اردو، فارسی کے مرد میدان ہیں لاشے محض جانتا ہوں مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہائے طاقت صرف کرتی ہے وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی ہے"

مولانا کے انتہائی رنج اور صدمے کا اظہار ہے ورنہ وہ ایسے نیک مزاج اور شریف النفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت نہیں آتی تھی اور یہ بھی انھوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ہے اور وہ بھی ایک ایسے صاحب کو جو ان کے اور اچھی کتابوں کے قدر دان تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی اور پھر وہ ایک عام حالت کا نقشہ ہے جس کا بیان کرنا کچھ ایسا معیوب نہیں ہو سکتا اگرچہ اس خط سے رنج اور صدمے کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور ایک طرح کی شکایت بھی پائی جاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کیلئے دل شکن ہو۔ اگر ان کے بعض نامور ہم عصر مصنفین کی تحریروں یا خطوط سے مقابلہ کیا جائے جو انھوں نے ایسے موقعوں پر لکھیں ہیں تو یہ تحریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے صدمے اور رنج کی انتہا یہ ہو وہ کیسا پاک سیرت ہوگا حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید کی دل سے قدر کرتے تھے اور سرسید کو مرے بھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا جب انھوں نے دیکھا کہ ابھی سے ان لوگوں کا جو سید کی محبت اور جاں نثاری کا دم بھرتے تھے تو انھیں بہت شاق گزرا۔ گھاؤ تازہ تھا پھوٹ پڑے۔

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے جو بہت ہی قابل افسوس ہے۔ ہمارے یہاں کے متمول اور صاحب ثروت لوگ کسی کتاب کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ مصنف ان کی خدمت میں اس کا نسخہ ہدیتہً پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کی بہتر سے بہتر کتاب بھی اتنی نہیں بکتی جتنی کہ دوسرے ممالک میں معمولی درجہ کی کتابیں فروخت ہو جاتی ہیں سرسیّد کے احباب کی اس بے اعتنائی کا ان کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انھیں تاریخوں میں ایک خط میں جو انھوں نے اپنے ایک نیازمند کے نام لکھا ہے اس دکھڑے کو بھر دیا ہے چونکہ یہ ایسی بپتا ہے جسمیں ہم سب مبتلا ہیں اس لئے اس خط کے ایک اور حصّے کے نقل کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

"میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بایوگرافی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں فی الحقیقت اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بایوگرافی کا حق ادا ہو نہیں سکا لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی شخص نے قلم یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی۔ یہ بار تنہا اٹھایا۔ پس اگرچہ یہ کام فی نفسہٖ کچھ قدر کے لائق نہ ہو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے۔۔۔۔ میں اس موقعہ پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جب میں نے مسدس مد و جزر اسلام کا پہلا اڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سرسید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں۔ میں نے جواب لکھ بھیجا انھوں نے اسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست

کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں اور اتنی وہاں بھیج دو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیج دیجئے۔ چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہوگئیں اور دوسرا ایڈیشن چھپانے کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہی کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا۔ اب ان کے بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ ان کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ تو کسی سے بھی امید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے۔

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد

چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم"

یہ خط بہت پُردرد ہی۔ خط کیا ہی ہماری قوم کی ناقدردانی کا مرقع ہی اگرچہ اس خط کو لکھے پورے چوبیس برس ہوے ہیں اور ملک کے حالات میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوگیا ہی لیکن علمی قدردانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہی ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم "

علی گڑھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھیں کمال ہم دردی تھی۔ ان معاملات میں قلمے۔ درمے۔ قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان کی تائید اور ہم دردی میں ایسی ایسی بے مثل اور بیش بہا نظمیں لکھیں ہیں کہ ان کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی ان کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں رُپے کے چندے پر بھاری ہی۔ ان خطوں میں بھی جا بجا کالج اور کانفرنس کا ذکر آتا ہی اور جو کچھ ان سے ہوسکتا ہی اس کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے خود شریک ہوتے ہیں دوسروں کو شرکت پر آمادہ کرتے ہیں۔ چندے کرتے ہیں۔

رائے دیتے ہیں۔ دوسروں کو رائے دینے اور کام کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپنے کی۔ اپنے وطن پانی پت میں انھوں نے تعلیم کی بہت کچھ اشاعت کی اپنے خاندان والوں کے سوا دوسروں کو بھی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کیں اور ہر قسم کی مدد دی۔ پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا۔

ان خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ہو اور جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انھیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی۔ جب وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ لغزش ہوگئی ہو یا کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت ہو تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی بُرا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اُن کے کہنے کا اثر ہوتا تھا مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو اپنے فرزند کے متعلق لکھتے ہیں۔

"معلوم نہیں کہ انھوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغلہ اختیار کیا یا نہیں۔ ان کو خدا تعالیٰ نے ایسی لیاقت دی ہو کہ ملک و قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور چوں کہ عنایت الٰہی سے تلاش معاش کی ضرورت نہیں ہو۔ اس لئے ان کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدردانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائگاں کھونا ہو اس موقع پر میں اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ عزیز موصوف بھی اس کو پڑھیں اور اگر درحقیقت وہ سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں۔ رباعی یہ ہو:- یاں وہ نہیں وقت عیش و آرام کا یہ موقع ہو اخیر فکر انجام کا یہ

بس حب وطن کا جب چکے نام بہت — اب کام کرو وقت ہے کام کا یہ

مولانا کا ایک نواسہ ہے جو ایک لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اس کا مزاج نازک ہوتا جاتا تھا۔ مولانا اس کی اس طرح ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کر سکتے۔ دنیا بھر کا کوئی علاج ایسا نہ تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو ڈاکٹروں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہے ان میں سے تو شاید ہی کوئی چھوٹا ہو۔ اگر کسی عطائی کو بھی سن پاتے ہیں کہ وہ اس بیماری کا علاج کرتا ہے تو وہاں پہنچتے ہیں اگر کسی عامل کو سن پایا تو اس کے پاس دوڑے پھرتے ہیں کسی دوست نے کوئی نسخہ بتا دیا تو اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہیں غرض اس کی وجہ سے مولانا کی زندگی تلخ تھی۔ وہ ایک بار اپنے چچا کے یہاں جاتا ہے اس وقت مولانا نے اسے خط لکھا ہے جس میں انھوں نے ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہے اور پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہے کہ اسے وہاں کس طرح رہنا چاہیئے۔ اس میں ایسے کام کی۔ تجربہ کی، دوراندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے کے قابل ہیں اور ایسی صاف ستھری سادہ زبان میں لکھی ہیں کہ ایک بچہ بھی پڑھ سکے اور سمجھ لے اور اثر قبول کرے۔ افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہے اور ہم اسے نقل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انھیں چیزوں سے ایک انشاپرداز کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں "اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا نہایت پر زور مضمون لکھا ہے ...... آپ ہی کا حصہ تھا۔ مگر برٹش ناردن پالیسی پر اس میں جا بجا نوک جھوک کی گئی ہے وہ سراسر خلاف مصلحت ہے ...... میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو للہ آپ اس سلسلہ کو چھیڑنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے۔" نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی

سے گوارا کر دیا ہے۔

ایک دوست کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تعزیت کا خط لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں" اگرچہ یہ موقع نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہی مگر میں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا خدا کے تمام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔ بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہوگئی ہے اسکی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے کچھ کام لینا چاہیئے آپ کو معلوم ہی کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہی؟ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ ان کی اہلیہ ان کی جوانی میں مرگئی تھیں بہت سے لوگوں نے ان کو دوسری شادی کی صلاح دی۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور اپنے بچوں کو اپنے کنار شفقت میں لیا۔ اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بسبب تجرد اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہوگئی تھیں، وہ کام لیے جنھوں نے آج ان کو تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ انکو حاصل نہ ہوتا آپ کے لئے یہ نہایت عمدہ موقع ہی کہ آپ ہمہ تن اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جایئے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہی تو خود بھی تحصیل علم کرو۔ اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ میں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھ خبر لے سکوگے اور نہ اپنی زندگی کا کچھ مزا اٹھاؤگے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور اولاد بے علم رہ جائے گی اور ان کو آپ سے کچھ محبت و الفت نہ رہے گی اگر ان کو اپنا قوت بازو بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت اور پاک دامنی کے ساتھ تجرد اور آزادی میں بسر کرو"

جب کوئی ان کی تعریف وستائش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے ٹال جاتے تھے اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں "میں آپ کے ریمارکس کا جو آپنے میری نثر کی نسبت کیے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر سچ یہ ہی کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم ونثر پر صحیح رائیں اس وقت تک جبتک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہوسکتیں بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کون سی ایسی خوبی ہی جس کی وجہ سے وہ اس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہی۔

می گریم واز گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست ندانم کہ کدام ست"

اسی شخص نے جب "حیات جاوید" پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں "حیات جاوید" پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہرحال آپکا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں یہ وہی خصلت ہی جس کو اہلِ ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔

ایک عزیز کو اکسٹرا اسسٹنٹی کا عہدہ ملا تو انھوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ انھیں کی سعی اور محنت کی بدولت ہی۔ مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمھاری سعادت مندی اور کسی قدر تمھاری نادانی کی دلیل ہی۔ اگر بفرضِ محال میری کوشش کو تمھاری کامیابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیئے جیساکہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے

کی کامیابی میں ہوتا ہی، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہو اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آج کل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں، غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں اپنی بساط سے زیادہ ان کی امداد کرتے ہیں تمام قوم کے لیے ویسی ہی کوشش کرتے ہیں، جیسی کہ خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لیے کرتا ہی، اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لیے وقف کر رکھا ہی قوم کی طرف سے اُن پر گالیاں پڑتی ہیں مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دُھن میں لگے ہوے ہیں یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم کو دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور انھیں کا صدقہ ہی کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہو گیا ہی۔"

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہی۔ مثلاً وہ نواب محسن الملک مرحوم کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں "ان کا ارادہ ایسا ہی ہو جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہی۔" یا وہ اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں کہ "آپ کا آرٹیکل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار میں نکلا ہی۔ میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی ...... کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہی وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہی۔ ایک دانشمند کا قول ہی کہ جب کسی بدصورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی ان کے قہقہوں میں شریک ہو جائے چوں کہ میں بھی ننگِ ٹرسٹیان ہوں اس لیے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔"

چونکہ مولانا ایک مشہور اور نامور شخص تھے اس لیے اکثر عزیز اور احباب انھیں

سفارشوں کے لئے تنگ کرتے رہتے تھے ایک ایسی ہی فرمائش پر وہ لکھتے ہیں
شاید تم اور اور لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف و
جوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں اکثر معزز اور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے
تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں پس میں جس کی جہاں کہیں سفارش
کرونگا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اے عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے دنیا دارالمعاوضہ
اور دارالمکافات ہے۔ جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلہ
کی توقع پر کرتا ہے۔ میں تمھاری ایک سفارش اس لئے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے
دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے۔ پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح
کا عوض متوقع نہ ہو کیونکر کارگر ہو سکتی ہے۔ جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و
منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک شہور گو یا جہاں کہیں
جاتا ہے امرا اس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت
نوکری بھی اسے مل جاتی ہے لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی
سفارشیں کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا التفات نہیں کرتا۔ یہی
میرا حال ہے . . . . .“

مولانا نے ایک ال نامہ بھی لکھا تھا جو ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا
کیونکہ اس میں ہر فرقے اور گروہ پر چوٹ ہے چند جملے انھوں نے اپنے ایک خط میں
لکھے ہیں مثلاً المذہب۔ اعلان جنگ۔ الدین تقلید آباد اجداد العلم۔ قسمے از جہل
مرکب الامتحان۔ آزمائش لیاقت ممتحان۔ الیونیورسٹی۔ کارخانہ کلرک سازی
العلی گڈھ پارٹی۔ شہید وفا۔ العلی گاڈھ کالج۔ پرورش گاہ طفلاں بدست ملیندلہا
الکلیشن وجہ موجہ براسے فیصلہ یک طرفہ“

ان خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم۔ یہ زیادہ تر

کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے کسی نے اگر کوئی بات پوچھی ہو تو اس کا جواب معقول دے دیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف ہوگئے ہیں۔ یا قابل مرتب کے ہاتھ نہیں لگے۔

ان خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ جواہرات حالی میں جو حال میں شیخ محمد اسمٰعیل صاحب نے پانی پت سے شائع کی ہے بعض نظمیں چھوٹے بچوں کے لئے مولانا کے نام سے درج ہیں ان میں اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خلف الرشید خواجہ سجاد حسین صاحب سے ان کے انسپکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمائش کی۔ انھوں نے ہامی بھر لی اور مولانا کو لکھا۔ مولانا کو طوعاً کرہاً قبول کرنا پڑا۔ لیکن اس زمانے میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انھوں نے یہ نظمیں مولوی محمد سعید صاحب مرحوم مدرس اول عربی و فارسی بورڈ ہائی اسکول دہلی سے لکھوا دیں اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کر دی۔

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت عاجز آگئے تھے اور چاہتے تھے کہ فراغت اور اطمینان سے بیٹھ کر کچھ علمی کام کریں لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہ ہوئی بلکہ اسی پہ حیرت ہے کہ ان تمام حالات میں انھوں نے اتنا بڑا کام کیونکر کر لیا۔ اردو ادب کے متعلق دو ایک کام ان کی پیش نظر تھے جن کا مسودہ انھوں نے خوب غور کرکے اپنے دل میں قائم کر لیا تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں انھیں پورا کر دیں لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسودے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ آخر آخر میں ان کا ارادہ تھا جیسا کہ خطوں سے معلوم ہوگا کہ اورنگ آباد میں رہ کر کچھ کام کریں لیکن علالت نے مہلت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تاہم وہ اتنا کچھ

اور ایسا کچھ کر گئے ہیں کہ کسی ملک و رکسی قوم میں ہوتے ان کی ہستی قابلِ فخر سمجھی جاتی ان کی زندگی علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک صاف، خالص اور بے ریا ہو کہ ہمیشہ اہلِ وطن کی رہ نمائی کریگی اور اُردو زبان پر تو ان کا اتنا بڑا احسان ہو کہ اہلِ زبان اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

ادب میں سیکڑوں دلکشیاں ہیں۔ اس کی بے شمار راہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہو (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہو اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہو بناوٹ کی باتیں جلد پُرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہو جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں۔ بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہو جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں! یہ ہمارے خمیر میں ہو۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہو جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اُس سے جھوٹ بولے اور یہی وہ فطری تقاضا ہو کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہو، غیروں کے لیے ہو اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لیے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہو۔ عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہو۔ تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کی بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہو تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہو۔ وہ ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ

اس کا خیال ہوتا ہی صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہی۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہی۔ وہ نہ دوسروں سے جوکتا ہی اور نہ اپنے آپ کو جھوڑتا ہی۔ اس وقت نہ اُسے خوف لاحق ہوتا ہی اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہی جو دلوں کو لبھا لیتی ہی اور یہی وجہ ہی کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہی وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ ان خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہی جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ہوتا ہی اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہی۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کے رکھ دیتا ہی اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو۔ جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اُس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل اِن خطوں میں لپٹا ہوا ہی۔

الناظر کا انعامی مضمون

اڈیٹر صاحب الناظر نے ہمیں اپنے پرچے کے انعامی مضمون پر ریویو کرنے پر توجہ دلائی تھی، لیکن ہم نے تبصرہ سے عمداً احتراز کیا کیوں کہ یہ بحث ایسی نہیں جو چند سطروں میں طے ہو جاے۔ مگر اڈیٹر صاحب نے اس کے بعد خط کے ذریعے سے تبصرہ کی فرمائش کی۔ لہذا تعمیل ارشاد میں ہم ایک سرسری نظر اس مضمون پر ڈالتے ہیں

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آزاد کی اردو شاعرانہ، نذیر احمد کی عامیانہ اور سوقیانہ اور حالی کی روکھی پھیکی ہے۔ اردو میں اگر کوئی اعلیٰ ادیب اور انشا پرداز ہوا ہے تو وہ شبلی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ بالغ نظر ادیبوں کی نظر میں کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔

علاوہ ادبی تنقید کے مضمون نگار نے مولانا نذیر احمد مرحوم کے حق میں سخت ناانصافی کی ہے وہ شبلی کو علامہ، حالی کو مولانا محمد حسین آزاد کو پروفیسر (یہ بھی غنیمت ہے) لکھتے ہیں لیکن نذیر احمد کو ہر موقع پر ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں جو شخص عربی کا اتنا بڑا جید عالم ہو جس نے قرآن کا بے مثل ترجمہ کیا ہو اور اصول و اخلاق اسلام پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہوں وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتا کہ اس کے نام کے ساتھ مولانا یا مولوی کا لفظ لکھا جاے، حالانکہ فرنگی محل، ندوہ اور جامعہ ملیہ کے معمولی طالب علموں کے ناموں کے ساتھ بھی مولوی یا مولانا کے لفظ لکھے جاتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لفظ عمداً لکھا گیا ہے اور اس کے لکھنے والے کی نفس کی کیفیت اور اس کی نیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے شخص سے کسی صحیح تنقید کی توقع رکھنا عبث ہے

مولانا شبلی زندہ ہوتے تو ان سے بڑھ کر کوئی اس پر نفرین نہ کرتا

آج کل یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ لوگ فصاحت و بلاغت، معنی و بیان

لفظ و محاورہ، ادب و انشا کے متعلق اِدھر اُدھر سے چن کر اچھی خاصی باتیں لکھ جاتے ہیں لیکن موقع و محل کو نہیں دیکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان اصول کو بیان کرکے ان کے تحت میں جو لکھ دیا وہ جائز ہے۔ اگر صحیح ذوق نہیں ہے تو اصول کچھ کام نہیں آتے۔ یہ حقیقت ہمیں اس مضمون میں جگہ جگہ نظر آئی۔

مولانا آزاد کی نثر کے نمونے دربار اکبری سے نقل کرکے لکھے گئے ہیں۔ حالانکہ معلوم ہے کہ اس میں بہت کچھ تصرف کیا گیا ہے اور مولانا حالی کی تصانیف میں تو بقول مضمون نگار "بلند اور پُر زور عبارت ملنی مشکل ہے" جب آدمی کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہوتا تو وہ چیخ و پکار اور شور و غل سے کام لیتا ہے۔ یہی بعض انشا پرداز کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بہت بلند اور پرزور عبارت لکھتے ہیں۔ مولانا حالی جس طرح الفاظ کا صحیح اور برجا استعمال کرتے ہیں اور واقعات و کیفیات بیان کرنے میں جیسا انھیں ڈھب آتا ہے اور جس طرح انھوں نے بیسیوں ٹھیٹ اردو کے لفظوں کو رواج دیا ہے اور بر موقع استعمال کیا ہے اس کی نظیر ہماری انشا پردازی میں نہیں ملتی۔ ہمارے ایک فاضل بزرگ جو عربی فارسی اردو انگریزی اور فرنچ میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں اور ان کا ادبی ذوق مسلم ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہماری زبانوں میں نثر تھی ہی نہیں مولانا حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے متین اور سنجیدہ نثر لکھی مگر الناظر کے مضمون نگار کی نظروں میں ان کی نثر "بلا کی پھیکی اور بے مزہ ہے"۔

قابل مضمون نگار نے جو بعض نمونے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف سے انتخاب کرکے لکھے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں "بلند اور پُرزور" عبارت کا کیا مفہوم ہے۔ مثلاً

"ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب

اسی محبوب کے قتل کے لیے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں۔ اور ہاتھ میں چھُری ہی۔"
اس عبارت کو پڑھ کر اُردو کے ادنیٰ ناٹک نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں۔
"اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔ دارالسلطنت کا لفظ یہاں کس قدر موزوں ہی۔
شاید یہی چیزیں قابل مضمون نگار کی زبان میں "اختراعاتِ فائقہ" ہیں۔
مضمون نگار صاحب ہلا ہوا، لواڑے، پٹخ پٹخ کر، کو متروک سمجھتے ہیں اور کھنڈنا جھپٹنا، بگٹٹ، بھٹور، کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے گرانی اور ناگواری کا موجب خیال فرماتے ہیں، اُن کے خیال میں چھیڑ خانی، پھٹکنا، لتاڑ، چھدارکھنا، تتو تھمو، ٹپٹ، ادلو، بنگھا پن اور اسی قسم کے دوسرے لفظ عامیانہ اور سوقیانہ اور ادبی مذاق کے لیے سخت ناگوار ہیں۔ انھیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہی اور اُس کی خوبی اور برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہی۔ لفظ بذاتہٖ نہ بھلا ہی نہ برا۔ ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے موقع استعمال اُسے ناگوار اور بُرا بنا دیتا ہی اور ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کر دیتا ہی۔ متروکات کے متعلق مناسب ہوگا کہ وہ جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کا مضمون مطالعہ فرمالیں جو اسی رسالے میں درج ہی۔
قابل مضمون نگار نے بار بار اپنے مضمون میں "عام بول چال" عامیانہ اور سوقیانہ کا لفظ استعمال کیا ہی اور عام لوگوں کی بول چال کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں معلوم ہوتا ہی کہ انھوں نے زبان کتابوں سے سیکھی ہی جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں وہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل زبان یہی ہی اور یہی رہے گی۔ مولانا شبلی مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ وہ

دوسروں کے مقلد ہیں۔ اور سب سے بڑے مقلد مولانا حالی کے۔ خاص کر سوانح نویسی اور ادبی تنقید انھوں نے حالی ہی سے سیکھی ہے، اور زبان میں آزاد، حالی اور نذیر احمد سے خوشہ چینی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نثر میں کوئی خصوصیت پیدا نہ کر سکے۔

یہاں اس کے متعلق بحث کی زیادہ گنجائش نہیں، لیکن مختصر طور پر اس قدر عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ عام یا عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا ایک عالمانہ خود پسندی اور بے تہی کی علامت ہے، یہی عام بول چال زبان کا سرچشمۂ قوت ہے، جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے۔ زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضروری ہے ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے، ورنہ وہ مردہ ہو جائے گی۔ ہندستان کی اکثر زبانوں کا یہی حشر ہوا جب نحویوں نے اپنے قواعد و ضوابط کے جکڑ بند سے انھیں مقید کرنا شروع کیا اور وہ کتابوں میں محدود ہو گئیں تو اسی وقت سے ان میں انحطاط پیدا ہونے لگا اور کچھ دنوں میں مردہ ہو کے رہ گئیں۔ عام بول چال زندہ زبان کے لیے بمنزلہ دل کے ہے، جس سے ہر وقت اسے خون پہونچتا رہتا ہے اور جس وقت یہ رسد بند ہو جاتی ہے تو زبان سوکھنی شروع ہو جاتی ہے، اور کتابوں کے اوراق میں بند ہو کے رہ جاتی ہے، تمام دنیا کی زبانیں جو مردہ کہلاتی ہیں اسی طرح مردہ ہوئیں۔ کیا ہم اردو کو ابھی سے محدود، مفلوج اور مردہ کرنا چاہتے ہیں؟

میں آخر میں مولانا نذیر احمد کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں جو مضمون نگار صاحب نے اپنے مضمون میں لکھی ہے اس کے آخر میں ان کی رائے لکھوں گا۔ اس سے ان کی ادبی ذوق اور تنقید کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

"ادھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اُدھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی۔ نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینے کا ہیلوٹھی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی، نانی

کی چہیتی، ماں کی لاڈو، مزاج کچھ تو قدرتی تیز، باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے، کریلا اور نیم چڑھا اور بھی چڑچڑا ہوگیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہوگیا۔ اب چھ، چھ بہنیے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکے پڑی تھی، مزاج میں وہی طنطنہ تھا۔ کوارپنے میں سوا گز کی زبان تھی۔ کچھ یوں ہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا، سو بیاہے سے ان کو بھی دھتکار بتاتی۔ بیٹا جنے پیچھے تو اور بھی کھل کھیلی، مردوں کا لحاظ اٹھا دیا۔ فہیدہ نے میاں کے روبرو بیٹوں کا بیڑا اٹھاتے تو اٹھا لیا لیکن نعیمہ کے تصور سے بدن پر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور جی ہی جی میں کہتی تھی کہ ذرا بھی اس بھڑوں کے چھتے کو چھیڑوں گی تو میرا سر سونڈ کر بھی بس نہ کرے گی۔"

اس پاک صاف ستھری عبارت کے متعلق مضمون نگار صاحب کی یہ رائے ہے کہ "اس زبان کے بولنے سمجھنے کا پورا پورا لطف تو گزشتہ صدی میں دلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ اٹھا سکتے تھے۔" اس سے بڑھ کر ناانصافی اور بدمذاقی ہو نہیں سکتی۔ ہم نے یہ عبارت کئی بار پڑھی مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ ملا جو اس وقت نہ بولا جاتا ہو۔ یا ٹکسال باہر ہو۔ اس سے بہتر زبان اس موقع کے لیے ہو نہیں سکتی۔ ہر جملہ موتیوں کی لڑی معلوم ہوتا ہے، اگر لائق مضمون نگار ان الفاظ اور جملوں کی جگہ جنھیں وہ قابل اعتراض سمجھتے ہیں دوسرے الفاظ اور جملے رکھ کر دیکھتے تو انھیں اپنی تنقید کی ساری حقیقت معلوم ہو جاتی۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی کا بڑا احسان اردو زبان پر یہ ہے کہ انھوں نے ٹھیٹ اردو کے ایسے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے۔ ادبی زبان میں داخل کردئے۔ ان سے زبان کی رونق دوبالا ہوگئی اور مطالب کے ادا کرنے میں خاص لطف پیدا ہو گیا۔ یہ بڑی جرأت کا کام تھا اور ان کی یہ جرأت بہت ہی قابل تحسین ہے۔

ورنہ خود پسند اور بے تہ انشاپردازوں کے ڈر سے جو بدقسمتی سے اپنے آپ کو ادیب بھی سمجھتے ہیں ہر شخص یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ آج ان دونوں بزرگوں کی بدولت سیکڑوں نئے پرمعنی اور پرمغز لفظ اور محاورے ہمارے ادب میں آ گئے ہیں جو اب ہر انشاپرداز استعمال کرتا ہی اور تو اور مولانا شبلی کی تصانیف ان الفاظ اور محاوروں سے بھری پڑی ہی، جو انھیں ان دو حضرات کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

بہرحال یہ مضمون ایک طالب علمانہ مشق کی حیثیت سے بہت اچھا ہی، اور اڈیٹر صاحب الناظر کا جو اصل مقصد تھا، یعنی رسالہ کا اشتہار وہ بھی اس سے حاصل ہو گیا ہی۔

ماورا

مجموعۂ نظم ، ن ، م ، راشد صاحب

ایک زمانے میں اردو پر فارسی کا اثر غالب ہوگیا تھا اور اس تقلید میں بری بھلی سب ہی چیزیں آگئی تھیں اسی طرح آج کل اردو پر مغربی ادب کا اثر بڑھ گیا ہے۔ صرف انگریزی لفظ اور خیال ہی ہماری زبان میں داخل نہیں ہوگئے، بلکہ بعض اوقات جملوں کی ساخت اور اسلوب بیان بھی انگریزی ہوتے ہیں۔ اس کا اثر نظم و نثر دونوں پر پڑا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے راشد صاحب کا مجموعۂ نظم ہے جو اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ علاوہ نظم کی ظاہری صورت کی تبدیلی کے انھوں نے طرز بیان اور خیالات میں بھی جدت دکھائی ہے۔ بعض نظمیں نظم عاری (یعنی بلینک ورس) میں لکھی ہیں۔ اس طرز میں اس سے پہلے بھی بعض صاحبوں نے کوشش کی، مثلاً طباطبائی، شرر، اسماعیل وغیرہ نے، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ راشد صاحب ان سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بعض مقامات پر بعض بند پاٹ ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان نظموں میں ایک آدھ لفظ نیا بھی نظر آتا ہے مثلاً:۔

اڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیارے میں
سرعت نور سے یا آنکھ کے پلکارے میں

پلکارے کا لفظ نیا ہے اور خوب بنایا ہے۔

ماورا کے تعارف نویس نے ان کی نئی تشبیہوں اور استعاروں کی دل کھول کے داد دی ہے، اور بے شبہ بعض قابل داد ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض مجھے بہت بھدّی یا مکروہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً:۔

آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں

ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں،

یا

کرچکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا ہوں میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی ہے دوبارہ بلند

کہیں خیال لفظوں میں پوری طرح ادا نہیں ہوا۔ جیسے اس شعر میں:۔

تجھے اک شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی
مجھ سے جس وقت ستارہ ترا وابستہ ہوا

"شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی" سے اصل مطلب ادا نہیں ہوتا یا اسی طرح بعض جگہ مصرعے بوجھل ہو گئے ہیں۔ یہ معمولی اسقام ہیں۔ ان سے راشد صاحب کی شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ان میں شاعری کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

نئے اسلوب اور اظہار کے نئے ڈھنگ کوئی جرم نہیں لیکن نئے ڈھنگ کیوں نامقبول ہوتے ہیں؟ اس لئے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے برتنے والے میں خامی ہے۔ اگر شاعر کے خیالات میں جدت، تازگی اور گہرائی ہے اور ان کا اظہار حسن اور سلیقے سے کر سکتا ہے تو نئے اسلوب ایک نہ ایک دن ضرور مقبول ہو کے رہیں گے۔ مثلاً نظم عاری کیوں مقبول نہ ہوئی؟ اس لیے کہ اس کے لکھنے والے اس پر قادر نہ تھے۔ اوّل تو وہ یہ نہ سمجھے کہ کن موضوعوں کے لیے اسے کام میں لانا چاہیئے۔ اور دوسرے کن بحروں میں وہ خوبی سے کھپ سکتی ہے۔ تیسرے قافیہ و ردیف کی تلافی وہ حسنِ اظہار سے نہ کر سکے۔

ادب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں۔ جس ادب میں تازگی، جدّت اور گہرائی ہے خواہ وہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو، نیا ہے، اور وہ ادب جس میں یہ خوبی نہیں

خواہ وہ آج ہی کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو، پرانا ہے۔

راشد صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی شاعری خصوصاً اردو شاعری اپنی خارجی اصل کے سبب ہمارے قومی شعور نغمہ کے ساتھ کوئی ربط و آہنگ نہیں رکھتی بلکہ ایک میکانکی علم عروض پر مبنی ہے، لیکن ساتھ ہی انھیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ عروض اور نحو سب میکانکی ہوتی ہیں۔ پہلے شعر ہے اور اس کے بعد عروض۔ اسی طرح پہلے زبان ہے، اور اس کے بعد صرف و نحو۔ منطق ہو یا صرف و نحو، عروض ہو یا موسیقی یہ سب ہماری بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اصل نہیں تغیر پزیر ہیں اور حالات کے لحاظ سے ان میں تبدیلی لازمی ہے۔ جب زندہ زبان اور ادب ایک حال پر قائم نہیں رہ سکتے اور ان میں تغیر لازم ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ موسیقی کے اصول ایک حال پر قائم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری نے ملک کی موسیقی میں تغیر پیدا کیا۔ اور اس شاعری کو اس موسیقی میں سمانے کے لئے نئی راہیں نکالیں اور آئندہ نکالنی پڑیں گی۔

ہمیں راشد صاحب کی نئی ڈھنگ کی شاعری پر ہرگز اعتراض نہیں اور نہ کوئی وجہ اعتراض ہوسکتی ہے لیکن اسے مقبول بنانے کے لیے ذریعہ اظہار یعنی زبان میں زیادہ حسن اور لوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جگہ جگہ خیال دب گیا ہے اور اس لئے اثر میں کوتاہی کرجاتا ہے۔

راشد صاحب کی شاعری یوں بھی آج کل کے شعرا سے جُدا ہے۔ ان پر مغربی ادب کا اثر ضرور ہے، (اور یہ کوئی بری بات نہیں)، لیکن وہ اپنے خیال میں آزاد ہیں۔ وہ ہمارے بعض نئے شاعروں کی طرح اس زمانے کے چلتے ہوئے فقروں اور لفظوں کو اپنی شاعری کا سہارا اور زینت نہیں بناتے وہ نہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں اور نہ کسی پیغام کے لینے کے آرزومند ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں چپکے چپکے اپنے افکار اور اپنے دل کی کیفیات اور واردات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے اشعار سے ان کے دل کی کیفیت جھلکتی ہے،

ان کے اکثر اشعار میں اس قدر حزن وملال اور بے بسی نظر آتی ہی کہ ان کو پڑھ کر بعض اوقات ان پر رحم آنے لگتا ہو اور بعض اوقات ان کی بھولی باتوں پر پیار آتا ہی

زندگی سب کے لیے معما ہی، اس کے اسرار عقل سے نہیں کھلتے۔ اس لئے راشد صاحب جھنجھلاتے ہیں اور اخلاق ومعاشرت، گناہ وثواب، عقل وفکر کے تمام اصولوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں لیکن لاچار ہیں۔ کچھ بس نہیں چلتا۔ شاید ہی زندگی انھیں کوئی نئی راہ سجھا دیے۔

راشد صاحب کو مشق سخن جاری رکھنی چاہیئے۔

آیات و نغمات

(جوش صاحب کا نیا مجموعۂ نظم)

جوش صاحب کوئی نئے شاعر نہیں، اچھے خاصے پختہ اور پرانے شاعر ہو گئے ہیں۔ نہ کسی تعارف کے محتاج ہیں نہ کسی تعریف کے، ان کے کلام میں جوش، روانی، حسن بیان بہ درجۂ کمال موجود ہے، اس میں زور بھی ہے اور شور بھی، وہ قدیم روایات و اخلاق مذہب و معاشرت اوہام و عقاید سے سخت بیزار ہیں اور مستانہ وار انھیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اسی قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں)، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور عقاید سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں، انقلاب، نظام جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں۔ انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس میں تغیر تو ہے۔ ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے، جس پر بیتتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔

جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور ہوتا ہے لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں۔